کتاب و سنت اور اسلافِ امت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ

اشرف الجرائد حیدرآباد

Volume:14 Issue:2 February 2021

مدیر

مولانا محمد عبد القوی

ادارہ اشرف العلوم ٹرسٹ حیدرآباد

www.iauth.in

اشرف الجرائد میں شامل تمام مضامین کی تمام جزئیات سے مدیر کا اتفاق ضروری نہیں

آئینۂ مضامین

اشرف الجرائد کی توسیع واشاعت میں حصہ لے کر اشاعتِ دین کا ثواب حاصل فرمائیں۔ ادارہ

درسِ قرآن



اپنی عورتوں کو سورۃ النور کی تعلیم دو

مولانا محمد عبد القادر فرید قاسمی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فَجَاءَتْهُ إِحْدَاهُمَا تَمْشِي عَلَى اسْتِحْيَاءٍ قَالَتْ إِنَّ أَبِي يَدْعُوكَ لِيَجْزِيَكَ أَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ۚ فَلَمَّا جَاءَهُ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ قَالَ لَا تَخَفْ ۖ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (سورۃ القصص: ۲۵)

ترجمہ: تھوڑی دیر بعد ان دونوں عورتوں میں سے ایک ان کے پاس شرم وحیا کے ساتھ چلتی ہوئی آئی، کہنے لگی: میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں، تاکہ آپ کو اس بات کا انعام دیں کہ آپ نے ہماری خاطر جانوروں کو پانی پلایا ہے، چنانچہ جب وہ عورتوں کے والد کے پاس پہنچے اوران کو ساری سرگزشت سنائی، توانہوں نے کہا: کوئی اندیشہ نہ کرو، تم ظالم لوگوں سے بچ آئے ہو۔

تشریح: اس آیت میں اپنے سیاق وسباق کے ساتھ کئی نکات اور کئی اہم مسائل ہیں لیکن اس درس میں حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی کی اس وصف خاص کو ذکر کرنا ہے جس کی کمی آج بنت حواء کو اخلاقی زوال کا شکار بنارہی ہے، اسلام نے اپنے آمد کے ساتھ ہی خواتین کو اسی وصف خاص کی چادر پہنائی اوران کے کردار کو سنوار کر عزوشرف اور مقام بلند سے نوازا جس کا تصور ماقبل اسلام ناممکن تھا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی یہ عادت رہی ہے کہ جب کبھی کسی کے محاسن کا تذکرہ کرنا ہوتا ہے تو صاحب محاسن واوصاف کے اس وصف کا ذکر فرماتے ہیں جو اس کا مابہ الامتیاز ہوتا ہے جیسا کہ مختلف انبیاء کرام علیہم السلام کا تذکرہ ان اوصاف سے کیا گیا جس میں وہ امتیازی شان رکھتے تھے۔

یہاں پر حضرت صفوراء کا تذکرہ اس خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے جو عورت کا اصل حسن وخوبی ہے، جب حضرت صفوراء بنت شعیب علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بلانے آرہی تھیں تو اللہ تعالیٰ کو اس لڑکی کے آنے اور دعوت دینے میں جو کردار سب سے زیادہ پسند آیا وہ یہ تھا کہ وہ لڑکی بڑی شرم وحیا کے ساتھ اپنے قدم آگے بڑھارہی تھی جب قریب پہنچی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگی میرے والد آپ کو بلارہے ہیں تاکہ آپ کو اس

احسان کا معاوضہ ادا کریں جو آپ نے ہم پر کیا تھا؛ یہاں دو باتیں امت کی تمام عورتوں کے لیے قابلِ غور و لائقِ تقلید ہیں، پہلی بات اس لڑکی میں شرم وحیا کا غلبہ تھا جو خود ایک باحیا و باکردار لڑکی ہونے کی علامت ہے، دوسری بات یہ کہ یہ لڑکی بذات خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دعوت دے سکتی تھی مگر دعوت کا پیغام اپنے والد کی طرف منسوب کرتے ہوئے سنایا کیونکہ کسی اجنبی مرد کو لڑکی کا خود اپنی طرف سے دعوت دینا خلافِ حیا تھا۔ امام بغویؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا وہ لڑکی بے باک نہ تھی کہ بے جھجک مردوں میں گھستی، پھرتی، دبتی، لچتی، بلکہ آستیں منھ میں ڈالے ہوئے شرماتی آئی۔

معاشرہ کے امن و فساد میں عورت کے کردار کو بڑا دخل ہے، عورت شرم وحیا سے مزین ہو تو اس کے بہترین اثرات معاشرہ پر مرتب ہوتے ہیں کیوں کہ ایک عورت کے سدھار پر ایک خاندان بلکہ نسلوں کا سدھار موقوف ہوتا ہے، اس لئے کہ عورت کی گود ہی پہلی تربیت گاہ ہوتی ہے اگر عورت شرم وحیا کی پیکر ہو تو اس کی کوکھ سے جنم لینے والے اور اس کی گود میں پرورش پانے والے باحیا و باکردار بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے اہلِ کوفہ کو حکم بھیجا تھا کہ وہ اپنی عورتوں کو سورۃ النور کی تعلیم دیں، ایک حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا عَلِّمُوا رِجالَكُم سورةَ المائدةِ وَعَلِّمُوا نساءَكُمْ سورةَ النورِ سورۂ نور کے مضامین میں پردہ داری، شرم وحیا کی اہمیت وضرورت اور اس کی خلاف ورزی کی مختلف شکلوں وصورتوں میں ان کے سنگین نتائج و عواقب تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں، جب خیر القرون میں خلیفہ وقت کو سورۃ النور کی تعلیم کا حکم دینے کی ضرورت پیش آئی تا کہ معاشرہ اخلاقی بے راہ روی سے محفوظ رہ سکے تو موجودہ دور اس کا اس سے زیادہ محتاج ہے کہ عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کو سورۃ النور کی تعلیم دی جائے تا کہ معلوم ہو جائے کہ عورت کا دوسرا نام حیا ہے، یہی اس کا اصلی زیور اور قدرتی حسن ہے۔

آج معاشرہ میں بے حیائی و بے حجابی کی وجہ سے جو مفاسد جنم لے رہے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں ہیں، مرد وزن کا بے محابا اختلاط، دوستیوں کے نام پر نوجوان لڑکوں و لڑکیوں کی آپسی ملاقاتیں، برقعہ کے نام پر بے حجابی، لباس کے نام پر عریانیت، فیشن کے نام پر فحاشیت، مساوات کے نام پر ہر کام میں مردوں کے شانہ بشانہ رہنا عام ہو گیا ہے، غرض یہ کہ حیا عنقاء اور حجاب مفقود ہوتا جا رہا ہے، اہلِ ہوس نے عورت کو ہر شعبۂ حیات میں اپنی ہوس کا نشانہ اور اپنی تجارت کی تشہیر کا ذریعہ بنا ڈالا۔ ضرورت ہے کہ بنت حواء کو حیا کا درس دیں، ازواج مطہرات و بنات طاہرات کے حیا کے واقعات پڑھ کر سنائیں ان شاء اللہ حیا کا گوہرِ نایاب جو مغرب کی گرداب میں چھپ گیا ہے پھر جگمگائے گا، گھر جنت نشاں بنیں گے اور معاشرہ امن کا گہوارہ بنے گا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اصلاح و تربیت کی اس حکمتِ عملی کو اپنانے کا ہم سب کو حوصلہ عطا کرے۔ آمین

درس حدیث



محتاج رشتہ داروں پر مال خرچ کرنا دوہرا اجر ہے

مولانا سید نذیر احمد قاسمی*

عَنْ سعدبن ابی وقاص رضی اللہ عنہ قال مرضتُ عام الفتح مرضاً اشفیتُ علی الموت فاتانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یعودنی فقلتُ یا رسولَ اللہ! ان لی مالا کثیرا ولیس یرثنی الا ابنتی أفاوصی بمالی کلہ قال لا قلت فثلثی مالی قال لا قلتُ فالشَطرُ قال لا قلت فالثلث قال الثلث کثیر انک ان تذر ورثتک اغنیاء خیر من ان تذرھم عالۃ یتکففون الناس وانک لن تنفق نفقۃ تبتغی بھا وجہَ اللہ الا اجرت بھا حتی اللقمۃ ترفعھا الی فی امرأتک۔ (متفق علیہ مشکوۃ باب الوصایا)

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں فتح مکہ کے سال اتنا سخت بیمار ہوا کہ موت کے کنارے پہونچ گیا چناں چہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری عیادت کے لئے میرے پاس تشریف لائے تو میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میرے پاس بہت مال ہے مگر ایک بیٹی کے علاوہ میرا کوئی وارث نہیں ہے تو کیا اپنے سارے مال کے بارے میں وصیت کر دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں! پھر میں نے عرض کیا کیا دو تہائی مال کے بارے میں وصیت کر دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں! میں نے کہا آدھا مال؟ تو فرمایا کہ نہیں! میں نے کہا تہائی مال؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہاں! تہائی مال کے بارے میں وصیت کر سکتے ہو اگر چہ یہ بھی بہت ہے اور یاد رکھو اگر تم اپنے وارثوں کو مال دار و خوش حال چھوڑ جاؤ گے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو مفلس چھوڑ جاؤ اور وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ جان لو! تم اپنے مال کا جو بھی حصہ اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے جذبہ سے خرچ کرو گے تو تمہیں اس کے خرچ پر ثواب ملے گا یہاں تک کہ تمہیں اس لقمہ کا بھی ثواب ملے گا جو تم اپنی بیوی کے منھ تک لے جاؤ گے۔

تشریح: ہر مسلمان کا یہ عقیدہ اور ایمان ہے کہ ذرہ سے لے کر پہاڑ تک کائنات کی ہر چیز خدا تعالیٰ کی ملکیت ہے، محدود مدت کے لئے انسان مجازاً ان چیزوں کا مالک کہلاتا ہے موت کا ایک جھٹکا ملکیت کے

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

دعوے داروں کو فنا کے گھاٹ اُتار دیتا ہے، اور خدا کا اعلان ہوتا ہے کُلُّ مَنۡ عَلَیۡهَا فَانٍ دھرتی کے سینے پر موجود ہر چیز کو فنا ہونا ہے وَيَبۡقٰى وَجۡهُ رَبِّكَ ذُو الۡجَلٰلِ وَالۡاِكۡرَامِ بقا کی صفت صرف آپ کے باعزت بزرگ تر رب کو ہی زیبا ہے، وَلِلّٰهِ مِيۡرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ زمین وآسمان کی ملکیت ومیراث بھی اللہ ہی کی ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان رب کی عنایتوں کا امین ہے اور کائنات اس کی مخدوم ہے، بندۂ مومن رب تعالیٰ کی نعمتوں کو اسی رُخ سے دیکھے اور برتے تو بے اعتدالی کا شکار نہیں ہوتا اس کے برعکس جب مالک ہونے کا غروراور بڑائی طبیعت میں آتی ہے تو مال اور جائداد کے سلسلے میں آدمی بے اعتدالی کا شکار ہوجاتا ہے۔ معاشرہ میں جہاں مال کے خرچ میں بے راہ روی پائی جارہی ہے اسی طرح اس نعمتِ خداوندی کو دینی راہوں میں خرچ کرنے میں بھی بے اعتدالی عام ہوچکی ہے، مذکورہ روایت اسی سلسلہ میں مکمل رہنمائی کررہی ہے۔

امراض کی شدت، عمر کی درازی اوراس جیسے احوال بہت سے انسانوں میں زندگی سے مایوسی اور نا اُمیدی پیدا کرتے ہیں اور آخرت کی پونجی جمع کرنے کی فکر میں آدمی اپنا مال زیادہ سے زیادہ راہِ خدا میں خرچ کردینا چاہتا ہے ایسا ہی کچھ احساس حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی طبیعت میں پیدا ہوا جب کہ وہ فتح مکہ کے سال شدید بیمار ہوگئے اور قریب المرگ ہوگئے اسی موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی عیادت کے لئے ان کے پاس تشریف لائے ہوئے تھے تب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ میرے قریبی وارثوں میں بیٹی کے علاوہ کوئی نہیں ہے اور خدا کی عطا کردہ دولت بہت ہے تو کیا میں پورا مال راہِ خدا میں خرچ کرنے کی وصیت کردوں تا کہ خوش نودیٔ رب حاصل کرلوں، اور یہ میرے لئے ذخیرۂ آخرت ہوجائے۔ نبی علیہ السلام نے منع کردیا، انہوں نے عرض کیا کہ کیا دو تہائی مال کی وصیت کردوں تب بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روک دیا پھر تیسری مرتبہ حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ کیا تہائی مال کی وصیت کردوں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں ہاں تہائی مال کی وصیت کرسکتے ہو لیکن یہ بھی بہت ہے۔

پھر اس طرف توجہ دلائی کہ دیکھو اپنے ورثاء کو غریب اور بدحال چھوڑنے سے بہتر ہے کہ تم ان کو خوش حال صاحب مال وجائداد چھوڑ کر جاؤ تا کہ وہ تمہارے بعد لوگوں سے مانگنے اور محتاج بننے کے بجائے عفت و پاک دامنی عزت ووقار کے ساتھ زندگی گذاریں یہ اُن کے ساتھ حسنِ سلوک اور تمہارے لئے صدقہ جاریہ ہے۔

جس طرح راہِ خدا میں دے دینا یہ باعثِ اجر وثواب ہے اسی طرح ورثاء کو مال دار چھوڑنا یہ بھی بڑے اجر کا سبب ہے اور اس سلسلہ میں عدل وانصاف کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے۔　(بقیہ صفحہ ۳۰ پر)

پیش گفتار

نیوا یجوکیشن پالیسی کے پس منظر میں علماءکرام ونظماءِ مدارس کی ذمہ داریاں

از: مدیر

اس وقت علماء کے درمیان ہر طرف نیوا یجوکیشن پالیسی پر چرچا ہو رہا ہے، بلکہ یہ پالیسی بیانات کا تازہ موضوع بنی ہوئی ہے، بعض لوگ سنجیدگی سے اس پر غور کر رہے ہیں، بعض دیکھا دیکھی سنی سنائی باتوں کو لے کر اور پالیسی کے خدو خال کو سمجھے بغیر ہی اندیشوں اور خطروں سے سراسیمگی پھیلا رہے ہیں اور بعض مبہوت و حیران ہیں۔

یہ عاجز اس سلسلے میں زیادہ معلومات یا موضوع کی بصیرت کا دعوے دار تو بالکل نہیں ہے البتہ معتبر علماء اور اہل خبر ونظر سے جس قدر جان سکا ہے اس کی روشنی میں قارئین سے ایک اجمالی اور مختصر سی گفتگو کرنا چاہتا ہے، بالخصوص چوں کہ اہلِ مدارس سے بھی ان معروضات کا تعلق ہے اور یہ وقت اس پر غور کرنے کے لئے بہت موزوں وقت ہے۔

پہلے زمانے میں تعلیم کا تربیت کے بغیر کوئی تصور نہ تھا، تعلیم گاہیں ہی تربیت وتہذیب کا فریضہ انجام دیتی تھیں جس کی تفصیل میں جانے کا اب موقع نہیں، لیکن ادھر کچھ عرصے سے دنیا کے تعلیمی نظام پر یہودیوں کی خاص تحریک ''ایلّومینیٹی'' نے قبضہ کر کے تہذیب ومذہب کو تصوّرِ تعلیم سے خارج کر دیا اور اس کی جگہ آزادی ومن مانی اور خدا بیزاری کو بچوں کا بنیادی وفطری حق قرار دیتے ہوئے اُسے تعلیمی نظام کا لازمی حصہ بنا دیا، ہندوستان چوں کہ مغربی تہذیب سے مرعوب ہے اس لئے اس نے بھی تربیت کے تلازم کو تعلیم سے جُدا کر کے سارا معاشرہ خراب کر لیا، البتہ تعلیم اور اس کے نظام کو مضبوط و مستحکم اور سہل بنانے میں ترقی کی طرف گام زن ہے۔

ہندوستان میں مسلم فاتحین سے قبل خواندگی کا تناسب نا کے برابر تھا اس لئے کہ مقامی باشندوں پر آریہ سماج کا جب تسلط ہوا اور انہوں ذات پات کے فلسفے کو لے کر انسانیت کو اونچے نیچے طبقوں میں بانٹ دیا تو تعلیم کا

حق اعلیٰ ذاتوں کے لئے خاص ہوگیا اور نچلی ذاتوں کو تعلیم جیسے فضل وکمال کا اہل نہیں سمجھا گیا، نچلی ذاتیں اکثریت میں تھیں تو اکثریت ناخواندہ اور معمولی وحقیر پیشوں سے وابستہ رہ گئی ۔لیکن جب مسلم حکم رانوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا تو جہاں ان کے اندر جہاں گیری اور بہتر حکم رانی کا ذوق تھا وہیں ملک کی ترقی ،خوش حالی اور نیک نامی کا شوق بھی تھا، جہاں انہوں نے بڑے بڑے شہر بسائے ،طویل طویل راستے بنا کر شہروں کو ایک دوسرے سے جوڑا، شان دار و بے مثال تعمیرات کرائیں، وہیں تعلیم گاہوں اور مدرسوں کا بھی بندوبست کیا، رعایا میں ذوقِ علم پیدا کیا اور بلا لحاظِ قوم وقبیلہ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کئے ۔چناں چہ کہا جاتا ہے کہ مسلم دورحکم رانی کے اختتام پر خواندگی کا تناسب شمالی ہند میں 90% فی صد اور جنوبی ہند میں 100% فی صد تھا۔

مسلمانوں کے بعد انگریزوں کا دور آیا، انہوں نے بھی ظلم وجبر اور ملکی املاک کی لوٹ کھسوٹ کی ناقابلِ فراموش تاریخ بنانے کے ساتھ ساتھ تعلیم وتعلّم کی جانب خاص توجہ دی، اس امتیاز کے ساتھ کہ مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کو مٹا کر عیسائیت زدہ نظامِ تعلیم جاری کیا گیا جو خیر خواہی کے بہ جائے خودغرضی پر مشتمل تھا اور جسے لارڈ میکالے کا سسٹم آف ایجوکیشن کہا جاتا ہے، فارسی، اردو، سنسکرت نابود کرکے انگریزی کا چلن عام کیا گیا، انہوں نے تصورِ تعلیم کو بھی بدل دیا، جو علم عزت ومرتبے کے حصول اور خدمتِ خلق کے جذبے کے تحت حاصل کیا جاتا تھا وہ صرف نوکریوں کے حصول اور معیشت کے استحکام کی غرض سے پڑھا جانے لگا، کیوں کہ ان کا مطمحِ نظر رعایا کو تعلیم یافتہ بنانا نہیں تھا صرف ان کی اپنی حکومت اور تجارت کے لئے اہل کار تیار کرنا تھا۔تجدید وترقی کا خوش نما لیبل دے کر ہندوستانیوں کو ہندوستان سے بے خبر اور ماضی سے لاتعلق کردیا، ابھی تک یہی تصور عام ہے کہ علم ایک ذریعۂ معاش ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب انگریز نے ہندوستان چھوڑا تو ملک میں شرحِ خواندگی صرف 17% فی صد رہ گئی تھی۔

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو دوسو سالہ طویل جد وجہدِ آزادی کے بعد ہندوستان انگریزی دست استبداد سے آزاد ہوا اور ۲۶/جنوری ۱۹۵۰ء کو ایک عظیم الشان آئین کے ذریعے آزاد جمہوری ملک قرار پایا، اسی دن ڈاکٹر راجندر پرشاد نے آزاد اور خودمختار جمہوریہ ہند کے پہلے صدر کی حیثیت سے حلف لیا، ملک کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد قرار پائے، وہ ایک بہترین صلاحیت کے حامل اور ماہر تعلیم تھے، انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ انگریزوں کی گرائی ہوئی شرحِ تعلیم کو بلند کریں اور باشندگانِ ملک میں ذوقِ تعلیم پیدا کریں مگر حکومت نئی نئی بنی تھی اور مطلوبہ بجٹ دینے سے قاصر تھی یا دیتی نہ تھی، اس کے باوجود انہوں نے ملک میں اعلیٰ تعلیم اور سائنسی علوم کی ترویج کے لئے کارہائے نمایاں انجام دئے، ان کی آرزو اور اُمید یہ تھی کہ تعلیم کا معیار اس سطح پر پہنچ جائے

کہ ملک میں بیرونی طلبہ بھی آ کر تعلیم حاصل کریں، چناں چہ مولانا نے اس وقت تک موجود تعلیمی اداروں کا معیار بلند کیا اور کئی نئے تعلیمی وتکنیکی ادارہ جات کا قیام عمل میں لایا اور ملک کے طول وعرض میں علم کا ایک نیا ولولہ پیدا کیا، اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کی صلاحیتیں اور فکریں رنگ لائیں اور تعلیم کے میدان میں انہوں نے ملک کو ترقی کی جس شاہ راہ پر ڈالا اور جو بنیادی ڈھانچہ بنایا اس کا نتیجہ پچاس سال کے بعد یہ سامنے آیا کہ اب ملک میں تعلیم کی شرح 80٪ فی صد ہے جو اگر چہ عالمی شرح کے مقابلے میں کم ہے لیکن بہت کم بھی نہیں۔

اس ابتدائی تعلیمی پالیسی میں دومرتبہ تبدیلی لائی گئی یا نئی پالیسی وضع کی گئی، ایک نظر ثانی سن 1968 میں عمل آئی تھی، اس کے بعد سن 1986 میں، پھر سن 1992 میں سابقہ پالیسی میں جزوی ترمیم کا عمل ہو چکا ہے، اس کے باوجود موجودہ حکومت کو ایک اور تعلیمی پالیسی کی فکر لاحق ہوئی اور جیسا کہ ان کا طریقۂ کار ہے اپنی ترجیحات کو بہ عُجلت ممکنہ اور بہ زورِ اکثریت وجود میں لے آتے ہیں اور ان کی وہ ترجیحات وترمیمات ایک مخصوص نظریہ رکھنے والوں کی دیرینہ آرزو اور پہلے سے طئے شدہ خاکے ہوتے ہیں، 29 جولائی 2020 میں منظورہ نئی تعلیمی پالیسی NEP کی بھی تقریباً یہی کیفیت ہے۔

یہ تعلیمی پالیسی جب مشورے طلب کرنے کے لئے نیٹ پر فراہم کی گئی تھی تو کوئی 450 صفحات پر مشتمل تھی، اس پر ماہرین تعلیم اور باخبر تنظیموں نے اپنی اپنی آراء وتجویزات حکومت کو بھیجیں جو تقریباً ایک لاکھ سے متجاوز تھیں، لیکن بعد میں جو 60 صفحات پر مشتمل پالیسی پارلیمنٹ میں منظوری کے لئے پیش کی گئی اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اس تفصیلی پالیسی کا خلاصہ تو کیا ہے لیکن تنقیدوں اور تجویزوں کا کچھ بھی لحاظ نہیں رکھا، ظاہر ہے کہ جب وہ اس نظامِ تعلیم NEP کو برسوں کی کوششوں اور ماہرین کی دوراندیشیوں کا ثمرہ اور ڈھائی لاکھ گرام پنچایتوں کی ضرورتوں کا حل قرار دے رہے ہیں تو انہیں شکایات کو سننے اور تنقیدوں پر غور کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

اس 60 صفحات پر مشتمل تعلیمی پالیسی مواد کو اچھی طرح سمجھنے والوں کا خیال ہے کہ یہ نہایت ہی مبہم مواد ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جلد بازی میں خلاصہ کما حقہ نہ ہوسکا یا بالقصد مبہم رکھنا مناسب سمجھا گیا تا کہ منظوری کے بعد عند الضرورت ان کی تشریح کی جا سکے واللہ اعلم، مگر تحت العبارات اور پس منظر سے مختلف خدشے اور اندیشے ماہرین کو محسوس ہو رہے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پالیسی کو جن لوگوں نے صرف تعلیمی اور تجارتی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے ان کو اس میں بہت کچھ اچھا لگا ہے اور بعض تجزیہ کاروں نے تو اُسے سو فی صد اچھا قرار دیا ہے، بعض تجزیہ کاروں کا ماننا ہے اور یہ بہ ظاہر صحیح بھی لگتا ہے کہ اس کا مقصد ملکی تعلیمی نظام کو بیرونی تعلیمی نظام سے

ہم آہنگ کرنا ہے تاکہ بیرونی یونی ورسٹیز کو تعلیم کا میدان سپرد کیا جاسکے اور ہر شعبے کی طرح نظامِ تعلیم بھی خانگی ہاتھوں میں چلا جائے جس سے حکومت کا بوجھ کم ہوجائے گا۔

ہم مسلمانوں کے لئے اس نئی تعلیمی پالیسی میں موجود خوبیوں کے اعتراف کے باوجود جو قابلِ فکر و تشویش امر ہے وہ قرونِ وسطیٰ سے قبل کی خالص ہندوانی تہذیب کو ''بھارتیہ کلچر'' کے نام سے اس میں شامل کیا جانا بلکہ لازم قرار دیا جانا ہے، یہ پالیسی سازوں کی خاص حکمتِ عملی رہی کہ انہوں نے نئی تعلیمی پالیسی کو اگرچہ بھگوا رنگ میں رنگ دیا مگر اُسے کسی مذہب سے منسوب کرنے کے بجائے ہر جگہ بھارت کے کلچر کا عنوان دیا، تاکہ کوئی اختلاف نہ کرسکے اور جو اختلاف کرے اس کو بھارت مخالف ہونے کا الزام دیا جاسکے، حالاں کہ قدیم ہندوستان کا کلچر ایک مخصوص عقیدہ و مذہب کا کلچر تھا اور جدید ہندوستان مختلف عقائد و مذاہب کا گہوارہ ہے جن کی اپنی اپنی تہذیبیں ہیں، اور دستور ہند کی روشنی میں تمام باشندگانِ ملک کو یکساں حقوق حاصل ہیں، اُن پر کوئی خاص رنگ زبردستی نہیں تھوپا جاسکتا، مگر جب کسی نے یک طرفہ طور پر کام کرنا طئے کرلیا ہو تو اسے کیا کیا جاسکتا ہے؟ بہ قول ایک بڑے عالمِ دین کے گذشتہ 70 برسوں میں آر ایس ایس نے اپنی شاکھاؤں سے لے کر یونی ورسٹیوں تک جو تعلیمی تجربات کئے ہیں یہ نئی تعلیمی پالیسی انہی تجربات کو قومیانے اور پورے ملک میں چلانے کے لئے بنائی گئی ہے، یعنی جو نظامِ تعلیم اب تک ایک خاص نظریئے اور تنظیم کا تھا وہ اب پورے ملک والوں کے لئے ہوگا۔

اس قسم کی جانب دارانہ پالیسیوں سے ملک کی سب ہی اقلیتوں کو اور انجام کار متأثر ہونے والے درج فہرست طبقات کو بے چین و فکرمند ہوجانا چاہیئے تھا لیکن اس وقت ملک میں بی جے پی کی سیاسی پالیسیوں نے جو ماحول بنا رکھا ہے وہ دیگر اقلیتوں اور دلتوں کے لئے ایک سراب سے کم نہیں، انہیں یہ باور کرادیا گیا ہے کہ ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے، ہم سب مل کر بہ مقابلۂ مسلم ایک قوم ہیں اور مسلمان ایک قوم! اس ماحول اور میڈیا کے چیخ و پکار نے حکمراں جماعت کے عزائم اور سیاسی حقائق کو پسِ پردہ ڈال دیا ہے، NEP کے سلسلے میں بھی ہمیں نہیں معلوم کہ دیگر اقلیتیں اور قبائل کیا فکر کررہے ہیں البتہ مسلمانوں میں بڑی بے چینی پائی جاتی ہے، وہ اس کے ممکنہ اثرات کو لے کر حیران ہیں اور ان کی یہ حیرانی حق بہ جانب بھی ہے، اس لئے کہ دینِ اسلام جس کے مسلمان پیروکار ہیں اس کی روح اور بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے، توحید کے بغیر نہ کوئی عمل قبول ہے نہ علم! اس لئے مسلمانوں کو خواہ وہ عملی و اخلاقی اعتبار سے کتنے ہی کم عمل کیوں نہ ہوں عقیدے کی سلامتی سے سمجھوتہ کسی حال منظور نہیں ہے۔

NEP کا بنیادی خاکہ جس طرح تشکیل دیا گیا ہے وہ اگر نافذ العمل ہو تو بالیقین اس کا اثر مسلم بچوں پر

ہوگا، مانا کہ تعلیمی معیار بلند ہوسکتا ہے مگر کیا مذہب وتہذیب کی قیمت پر اس کو گوارا کیا جا سکتا ہے؟ بہت سے پڑھے لکھے مسلمان یہ کہتے ہیں کہ اصل چیز عقیدہ ہے تہذیب وکلچر کوئی اہمیت نہیں رکھتے، حالاں کہ کم از کم تعلیم یافتہ طبقے کو تو ایسی بات نہیں کہنی چاہیئے، اس لئے کہ تاریخ اقوام واُمم میں یہ حقیقت عیاں ہے کہ جس قوم نے اپنی تہذیب مٹادی وہ اپنا عقیدہ بھی کھو بیٹھی۔ تو اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ بچوں کو تعلیم سے محروم بھی نہیں رکھ سکتے اور منظورہ پالیسی کے ذریعہ تعلیم گاہوں کا جو ماحول بنے گا اس ماحول کے توحید مخالف اثرات کو گوارا بھی نہیں کر سکتے، اسی سوال کے جواب میں چند معروضات پیش خدمت ہیں:

۱ء پہلی بات تو یہی ہے کہ بہ حیثیت مسلمان ہمیں حالات سے گھبرانا نہیں چاہیئے، مایوسی کفر ہے، توکل علی اللہ کے ساتھ حالات کے سنجیدہ و بامقصد مقابلے کے جائز اسباب اختیار کرنا چاہیئے، ہم ایک زندہ قوم ہیں اور باحوصلہ وذی صلاحیت افراد پر مشتمل قوم ہیں، جب ہم نے ملکوں اور قوموں کے حالات بدلے ہیں تو خود اپنے کو حالات وخطرات سے محفوظ رکھنے کی راہیں کیوں نہیں نکال سکتے؟ اس لئے مایوسی کو قریب آنے نہ دیں، ہمیں اسی ملک میں رہنا ہے اور اپنے عقیدے و مذہب اور تہذیب اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پاس داری کے ساتھ رہنا ہے۔

۲ء دوسری بات یہ ہے کہ غفلت اور سُستی وکاہلی مسلمانوں اور زندہ قوموں کا شیوہ نہیں ہے جو دل احساس کے ٹیس سے خالی ہو جاتے ہیں، جو تمنائیں غفلت کی چادر اوڑھ لیتی ہیں، جو عزائم سُست روی کا شکار ہو جاتے ہیں اور جو قوم بے کاری پر فخر کرنے لگتی ہے، وہ کبھی اپنی قسمت چمکانے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتی، بے عملی و بے کاری کے ساتھی خیالی پلاؤ پکانے والے ایک دن نامرادی کی گہری کھائیوں میں گر پڑتے ہیں، اس لئے ہمیں اپنے نوجوانوں کو جہد وعمل کا عادی اور چستی وسنجیدگی کا خوگر بنانے پر توجہ دینی ہوگی، اس وقت ملت کا ایک بڑا طبقہ بے کاری کا شکار ہے، دوسروں کے دست نگر رہنے اور اپاہج بن کر سوچتے رہنے سے بہتر کسی معمولی پیشے کو اختیار کرنا اور کچھ کمانا ہے، ایک بڑی تعداد بچوں کی تعلیم سے دور ہے، مسلمانوں میں گریجویشن تکمیل کر لینے والے بچوں کی شرح قابلِ افسوس حد تک کم ہے، علماء کرام اور دانشورانِ قوم کو چاہیئے کہ ملت کو ان دو ناسوروں سے نکالنے کی ممکن کوشش کریں، کیوں کہ بے عملی و بے کاری کبھی بھی اچھی چیز نہیں تھی مگر ملک کے موجودہ حالات میں تو بالکل اس کی گنجائش نہیں رہ گئی ہے، اس کے بہ غیر نہ مال داروں کو مال داری کام آئے گی نہ غریبوں کی غربت پر کوئی رحم کرنے والا ہوگا۔

۳ء بچوں کے عقیدہ وایمان کی پختگی اور الحاد و بے دینی سے حفاظت کے لئے ان کے اندر توحید، رسالت

اور آخرت کے عقیدوں کو ان کی فہم کے اعتبار سے مضبوط کرنا اور اللہ تعالیٰ کی معرفت، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اور قرآن کی عظمت پیدا کرنا بہت ضروری ہے، چوں کہ بچے بچّے ہوتے ہیں ماحول سے متأثر ہوتے اور کتاب کے مقابلے میں سمعؔ و بصرؔ سے زیادہ سیکھتے ہیں اس لئے مذکورہ بالا مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دو وسائل بہت اہمیت رکھتے ہیں، نمبر ایک گھر کے ماحول کو اسلامیانا اور ماں باپ کی باتوں اور کاموں میں اللہ تعالیٰ کا بہ کثرت تذکرہ ہونا، نمبر دو مکاتب کا محلّے کی ضرورت کے بہ قدر جگہ جگہ قائم کیا جانا۔

پھر ان مکتبوں کو منظم و مؤثر اور مفید مطلب بنانے کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے، نمبر ایک محلّے کے متمول طبقے کو آمادہ کر کے معلمین کو معقول حق الخدمت دینا۔ نمبر دو معلمین کی ایسی تربیت کرنا کہ وہ مکتب میں ہزار پندرہ سو کے لئے نہ آئیں ایک نسل کی تیاری اور انہیں مستقبل میں خوش عقیدہ و خوش اخلاق دیکھنے کے لئے آئیں، بے مقصد یا تنخواہ کے مقصد کے لئے کام کرنے والے سے وہ محنت نہیں ہوسکتی جو بے غرض و با مقصد کام کرنے والے سے ہوسکتی ہے، یہ اہم مسئلہ ہے، اکثر جگہ مکتبوں کی ناکامی کا یہی سبب ہے، ایسا نہیں ہے کہ ملت میں ایسے افراد نہیں ہیں، بہت اچھے اور پیارے لوگ مل جائیں گے بس ان کی درمندانہ تشکیل اور مؤثر تربیت کی ضرورت ہے۔ نمبر تین یہ کہ مکتب میں بچوں کو کسی نصاب کا پابند کرنے کے بہ جائے شروع میں بلیک بورڈ کے ذریعہ اجتماعی تعلیم دینا، کیوں کہ اس عمر کے بچے اسکولوں میں بلیک بورڈ اور ایکشن کے ذریعہ حصولِ علم کے عادی ہوتے ہیں، انہیں کتاب و نصاب کا پابند کرنا زائد بوجھ اور ان کی نفسیات و تجربات کے خلاف ہے، ہاں! اساتذہ کو کتاب اور نصاب کا پابند کیا جاسکتا ہے تاکہ انہیں معیار و مقدار کا پابند اور مسئول بنایا جاسکے۔

کام کی ترتیب اس طرح ہو کہ قاعدے کا سبق تھوڑا تھوڑا آگے بڑھتا رہے، ہر ہفتہ ایک آیت یا حدیث، عقیدہ، عمل یا اخلاق سے متعلق یاد کرائی جائے، ایک مسنون مختصر سی دعا اور ایک فقہی مسئلہ، یہ کام ہفتے میں پانچ دن ہو یعنی قاعدہ تجوید کے اسباق روز ہوں اور بقیہ چیزوں کا پورے پانچ دن ایک ہی سبق چلتا رہے، چھٹے دن کوئی تجربہ کار عالم ان بچوں کو اپنے اطراف لے کر بیٹھے اور انبیاء کرام، صحابہ کرام، اور اولیاء عظام کے واقعات دلچسپ انداز اور بچوں کے معیار کے مطابق سُنائے، اسی دن اُن کو سنت کے مطابق وضو کر کے اور نماز پڑھ کر دکھلائے، چند ہفتوں کے بعد اُن سے وضو کروا کے اور نماز پڑھوا کے دیکھے غلطیوں کی اصلاح کر دیا کرے؛ پھر جب قاعدہ ختم ہوجائے تو انہیں وسطانیہ کی جماعت قرار دے کر آگے بڑھا دیا جائے۔

وسطانیہ میں ناظرہ قرآن مجید کے ساتھ دینیات کی کوئی سہل کتاب پڑھا دی جائے خواہ سُنا کر ہی سہی، مگر عقائد کی مزید تشریح کی جائے، چہل حدیث اور چہل دعا حفظ کرا دی جائے، پورے سال میں یہ کام کچھ مشکل

نہیں ہے۔اس کے ساتھ ہفتہ وارای ذہن سازی کی مجالس بھی قائم رہیں۔

فوقانیہ میں چند سورتوں کا حفظ ،فقہ کی کسی کتاب کا امتحان اور تاریخ اسلام کا مطالعہ کرادیا جائے ، یہ سب بچوں کی استعداد کے مطابق ہوگا مگر اتنا پڑھ لینے اور پا لینے والے طلبہ انشاء اللہ اسکولوں کے ماحول سے مرعوب یا متأثر نہیں ہوں گے ، اپنے عقیدے و دین پر اعتماد واطمینان حاصل رہے گا ، بلکہ دینی ذوق بڑھتا ہی رہے گا بشرطے کہ یہ کام ٹرینڈ اساتذہ کے ذریعے دل چسپ انداز میں ہو۔

یہ میرا خیال ہے جولوگ نصاب کی پابندی کے ساتھ اچھا کام کررہے ہیں اس ترتیب سے بھی کام کیا جاسکتا ہے مگر انداز جتنا آسان ہوگا ہر طبقے کے لئے مفید ہوگا اور بچوں کی دل چسپی کا سبب بنے گا۔

ظاہر ہے کہ یہ سب کام صرف علماء کرام نہیں کرسکتے ، وہ اپنے کام کو لے کر کھڑے ہوں ، پیشہ ورانہ شعبوں سے تعلق رکھنے والے مخلص مسلمانوں کی ایک جماعت ان کی فکروں میں شامل وپشت پناہ ہوجائے اور متمول وتاجر طبقہ بہ قدر ضرورت سرمایہ فراہم کرنے کا بوجھ سر لے ، اس میں کوئی کسی کا محسن ہو نہ احسان مند بلکہ سب اپنے اپنے فرائض کو ادا کرنے اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے والے ہوں۔

۴؎ NEP کے ذریعہ دین وایمان پر پڑنے والے متوقع اثرات سے ممکن حد تک اپنے بچوں کو بچانے کے لئے بہتر ہے کہ متمول مسلمان وسیع پیمانے پر عصری تعلیم کے اسکول قائم کریں ،منظورہ پالیسی میں پرائیویٹ اسکولوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے ، پرمیشن کو آسان کیا ہے اور سہولتیں دینے کا وعدہ کیا گیا ہے بہ شرطے کہ اس نظام کی پابندی کی جائے ،تو اچھا ہے کہ ہم محلہ محلہ اسکولز قائم کریں اور ایک دوسرے کے تعاون سے انہیں ایک چین بنالیں تو حکومت کے نظام ونصاب کے باوجود اسکول کے ماحول ، اسپیشل کلاس اور خارجی مواد کے ذریعے بہت حد تک اسلامی تشخص ومذہبی امتیاز کو برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ بہت مسلمانوں کے پاس موروثی جائیدادیں بے کار پڑی ہیں ، بال بچوں کے لئے رکھی ہوں گی ، کوئی حرج نہیں لیکن اگر انہیں تعلیمی تجارت میں مشغول کیا جائے تو ملت کا ایک بڑا کام بھی نکل جائے گا اور کاروبار بھی ہوجائے گا ، البتہ اس کا خیال رکھا جائے کہ ان اسکولوں کا معیار تو بلند ہو مگر اخراجات قوم کے تحمل سے زیادہ نہ ہوں ، اگر بہت نادار بچّے ہوں تو اپنی زکوتیں اُن پر صرف کرکے یا نفع میں سے ایثار کرکے اُن کی تعلیم کو بھی یقینی بنایا جاسکتا ہے ، بسا اوقات اس طبقے سے بھی بڑے قیمتی جوہر مل جاتے ہیں ، اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہماری قوم کے تعلیم یافتہ لڑکے اور لڑکیاں روزگار سے وابستہ ہوجائیں گی۔

یہ یہاں کہنے کی بات تو نہیں ہے مگر دل گداز واندوہناک حقیقت ہے کہ بہت سی مسلم لڑکیاں غیر مسلم

تاجروں کے پاس بہ طور ملازمت کے رکھی ہوئی اور ان کی ہوسِ نفس کی شکار بنی ہوئی ہیں، وجہ یہ ہے کہ غربت کی وجہ سے نہ شادیاں کرسکتی ہیں اور نہ نارِ شہوت کو بجھانے کا حلال انتظام کرسکتی ہیں۔ بعض متعصب تنظیموں نے اپنے بچوں کو یہ سمجھایا ہوا ہے کہ مسلم نوابوں نے تمہاری ماؤں کو داشتہ بناکر رکھا تھا اور اب تمہیں اس کا انتقام لینا ہے، ہمارے احباب نے جب ایسی بچیوں کو سمجھانے کی کوشش کی تو وہ اپنی ناداری کی ایسی بپتا سناتی ہیں کہ حل اور متبادل نظر نہیں آتا، خوفِ خدا اور عذابِ آخرت سے ڈرایا تو جاسکتا ہے مگر اس سے بھوک کو مٹایا نہیں جاسکتا، کیا ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امت کی ان ضرورتوں کی بھی فکر نہیں فرماتے تھے؟ کاش! ہماری فضول خرچیاں ان کاموں میں لگ جاتیں اور ہماری خیراتیں توازن وتناسب کے ساتھ صرف ہوسکتیں!!

۵ بچیاں تو پھر بھی کچھ نہ کچھ پڑھ لیتی ہیں لیکن بہت سے مسلم بچے تعلیم میں نہ چل سکنے کی وجہ سے یا غلط ماحولوں میں پڑ جانے کی وجہ سے یا گھریلو مسائل کی وجہ سے یا والدین کے اختلافات کی وجہ سے ترک تعلیم کرکے آوارہ گرد یا جرائم پیشہ بن جاتے ہیں، ان بچوں کی اصلاح و درستی بھی بہت ضروری ہے، ان کے مستقبل کی فلاح کے لئے بھی معاشرہ کو بدنامی سے بچانے کے لئے بھی۔ اس کے لئے اسلامی ماحول اور ضروری تعلیم کے ساتھ ہر علاقے میں ایک صنعت گاہ کا قیام عمل میں لایا جانا چاہیئے، یہ صنعت گاہ خواہ کسی رئیس کے بذلِ خیر سے چلائی جائے خواہ چندۂ عام سے اس میں بچوں کو دین کی ضروری تعلیم اور اسکول کی بہ قدر تحمل تعلیم دیتے ہوئے کسی ہنر سے آراستہ کیا جائے، وقت پر نماز پڑھنے، سچ بولنے اور وعدہ خلافی نہ کرنے کی خوب مشق کرائی جائے۔

کاری گر بلالحاظِ مذہب ہر سماج کی ضرورت ہے، لوگ اچھے کاری گروں کو ترستے ہیں، اسلام میں صنعت وحرفت کی اور قوتِ بازو سے کمانے کی بڑی فضیلت آئی ہے، بخاری شریف میں امام بخاریؒ نے صوّاغ، حدّاد، قصّاب، نجّار، خیّاط، نسّاج، عطّار، حجّام وغیرہ ایک ایک کے نام سے ابواب قائم فرمائے ہیں تاکہ مسلمان ان پیشوں کو معیوب نہ سمجھیں، سوال کے بہ جائے ہنر کا استعمال کرنا سیکھیں، کوئی صاحبِ خیر علماء کی نگرانی میں یہ کام کرکے تو دیکھے، مسلم سماج میں ایک خوش گوار تبدیلی آئے گی ایک طرف آوارگی اور جرائم کا خاتمہ ہوگا، دوسری طرف اچھے کاری گر وقت پر دستیاب ہوسکیں گے، اور اللہ نے چاہا تو یہ دیندار اور خدا سے ڈرنے والے کاری گر غیر مسلموں پر اسلام کا حسین تاثر پیش کرنے میں بھی کامیاب ہوں گے، خود ان کے گھروں کی معاشی تنگی اور بچیوں کے مسائل ختم ہوں گے۔ مجھے اس کام سے بہت اچھی امیدیں ہیں اور 30 سال سے آرزو ہے مگر کوئی ایسا بندہ نہ مل سکا جس کے ذریعے میں یہ کام کرکے دکھا سکتا، لیکن مایوس نہیں ہوں انشاء اللہ کسی کی سمجھ میں یہ کام ضرور آئے گا اور کبھی نہ کبھی مسلمان اس طرف توجہ دیں گے، مدارس اور اسکولوں میں طالبین کو باکمال بنانا کوئی بڑا کمال

نہیں ہے، کمال تو یہ ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی! ہم نے سماج کے اس طبقے کو نفرت کے ذریعے دور تو کیا مگر قبول کرنے اور سینے سے لگانے کی ہمیں توفیق نہ ہوئی، افسوس، ہم ہر سال اپنی قوم کے کتنے ہیرے کھوتے اور کتنے سورج ڈوبتے دیکھتے ہیں۔

۶؎ اور اب چھٹے نمبر پر جس تجویز کا ذکر کرنے جارہا ہوں وہ مدارسِ دینیہ سے متعلق ہے اور ڈر ہے کہ بہت سے یارانِ طریق کو ناگوار بھی ہو بلکہ تنقیدیں شروع ہو جائیں، کیوں کہ تجربے سے گذر چکا ہوں مگر چوں کہ یہ تجاویز بہ درجۂ مشورہ ہی ہیں اور الحمد للہ تعالیٰ سوزِ دل اور خلوصِ نیت سے عرض کی جارہی ہیں اس لئے ہمت کر کے اس کو بھی پیش کر رہا ہوں۔

ہندوستان میں مدارسِ اسلامیہ اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتِ عظمیٰ ہیں جن کی تعریف سے قلم قاصر و عاجز ہے، مدارس کا یہ نظام گو عہدِ رسالت ـــــ علی صاحبھا افضل الصلوٰت و ازکی التحیات ـــــ سے لے کر آج تک ہر دور میں جاری وساری رہا، اور اسی کی برکت سے تحفظ اسلام کی صورتیں بنتی اور محافظینِ اسلام کے مورچے تیار ہوتے رہے لیکن برطانوی ہندوستان میں حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی رحمہ اللہ اور ان کے رفقاء کار کے ذریعہ وجود میں آیا مدارس اسلامیہ کا یہ مخصوص نظام اور ملک گیر تحریک دراصل انگریزی نظامِ تعلیم کے تخلیق کار ''لارڈ میکالے'' کے مقابلے میں تھا، اس نے ارادہ کیا تھا کہ اپنے نظامِ تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کو صورتاً مسلمان اور فکراً آزادِ اسلام بنا دوں گا اس کے پاس وسائل و ذرائع تھے، اس کے سر پر ایک طاقت ور حکومت کا سایہ شفقت تھا مگر اس کے عزائم کا مقابلہ کرنے اور اس کی گردنِ الحاد توڑنے کے لئے تقدیرِ الٰہی سے ایک ملّائے بے سروسامان کھڑا کیا گیا تھا جس کی فراستِ ایمانی وقوتِ روحانی نے وہ کام کر دکھایا جس نے نہ صرف یہ کہ مسلمانانِ ہند کو اس کے بُرے عزائم سے بچایا بلکہ خود اس کی حکومت کو نامرادی و رسوائی کے ساتھ ملک سے نکل جانے پر مجبور کر دیا، مدرسہ تحریک نے ملک وملت کو کیا کیا دیا یہ ایک مستقل موضوع ہے اور ناقابلِ انکار تاریخی حقائق ہیں، ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ کسی بھی نیک اور اچھے کام میں مقاصد کو متأثر کئے بغیر ذرائع و وسائل بدلتے رہنے کی گنجائش ہوتی ہے، کام دین کا ہو یا دنیا کا حالاتِ زمانہ کے ساتھ اسباب و ذرائع تبدیل کئے جاتے رہتے ہیں، نہ کئے جائیں تو پھر وہ کام اپنی معنویت و نافعیت کھو بیٹھتا ہے، مدارسِ اسلامیہ کا اصل مقصد تحفظِ دین اور اِعدادِ محافظین ہے، اس مقصد کے حصول کے لئے ہر دور میں اس دور کی ضرورت کے مطابق تبدیلیاں ہوتی رہیں اور اسی وجہ سے یہ نظام پوری کامیابی کے ساتھ تاہنوز قائم و سدا بہار ہے۔

جن باقیض اکابر کا ہم نام لیتے اور فخر کرتے ہیں وہ اسلامی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے معاون علوم سے بھی اچھی طرح یا بہ قدرِ ضرورت واقف تھے، دوسری جانب اس زمانے کے میدانِ دعوت یا مدعو لوگ اسلامی علوم اور مسلمانوں کی زبان سے بے خبر و نابلد نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ حضرت حجۃ الاسلامؒ کو پنڈتوں کے ساتھ اور مولانا کیرانویؒ کو پادریوں کے ساتھ مقابلہ ومناظرہ میں تک کوئی دشواری نہیں پیش آئی، جن اکابر نے صرف اصلاح المسلمین کا کام کیا ہے ان کے دور میں مسلمانوں کی دینی ولسانی استعداد ان کے علوم اور زبان کو سمجھنے کی اہل تھی، اگر امداد الفتاویٰ کے جوابات کا سوالات سے تقابل کریں تو خود اندازہ ہوجائے گا کہ مفتی کی زبان مستفتی کے لئے قابل فہم تھی یا نہیں!

لیکن ملک میں جب انگریزی نظامِ تعلیم اور انگریزی زبان کو انگریز حکومت کی ابلہ فریبی سے متأثر ہوکر مسلمانوں نے اپنے اوپر مسلط کرلیا اور مادری زبان اردو کو خیر باد کہہ دیا تو رفتہ رفتہ اب یہ نوبت آگئی ہے کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد بالخصوص عصری تعلیم یافتہ طبقہ مذہبی اصطلاحات، قدیم تعبیرات اور علماء کی زبان سمجھنے سے قاصر ہے، جس کے نتیجے میں دینی ذوق رکھنے والا جدید تعلیم یافتہ طبقہ نام نہاد اسلامی اسکالرز ـــــ جن میں بعض مخلص اور ہم درد ہوتے ہیں مگر اسلامی احکام کے مقاصد اور اصولِ دین سے ناواقف ہونے کی وجہ سے صراطِ مستقیم سے منحرف ہوتے رہتے ہیں اور بہت سے بالکل گم راہ اور ڈھٹائی سے منصوصات اور اجماعیات تک کا انکار بلکہ مذاق کرتے رہتے ہیں ـــــ کو سننے اور فالو کرنے لگ گیا ہے، پھر اس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ علماء سے دور بلکہ بدگمان ہوتا چلا گیا، کیا اس میں غلطی اُن سے زیادہ یا ان کے برابر ہماری بھی نہیں ہے؟ آخر جس احتیاط کے ساتھ سچے عقیدوں اور اچھی تعلیمات کے حاملین ہم نے تیار کئے اور انہیں کتاب وسنت کے نور سے منور اور دینی احکام وعلوم سے واقف کیا وہ اس لئے تو نہیں کیا کہ ان کے علوم انہی کے سینوں میں دفن ہوکر رہ جائیں، علماء کی تیاری کا مقصد عوامِ امت کو فکری گم راہیوں سے بچانا اور عملی کوتاہیوں سے محفوظ رکھنا ہے، اگر علماء دعوتِ دین کے معاون علوم سے ناآشنا وسائل دعوت کے استعمال سے بے خبر اور مدعو قوم میں رواج پذیر زبان سے ناواقف ہوں گے تو وہ گونگے اور اپاہج داعی کہلائیں گے یا نہیں؟ لیکن ابھی تک اتنی موٹی بات ہمارے حلق سے اُتر نہ سکی، اس کی وجہ حالات وضروریات سے بے خبری یا جاریہ طریق پر ناروا جمود واصرار کے علاوہ اور کیا ہوسکتی ہے؟

بلاشبہ لاکھوں اہل حق کے خان دانوں سے تعلق رکھنے والے مسلمان ملحدوں اور گم راہوں کے ہتھے چڑھ گئے اور دن بہ دن بھٹکتے جارہے ہیں ہم ان کی گم راہیوں پر افسوس بھی کررہے ہیں اور ان کی گم راہیوں کا انہی کو

قصوروار ٹھیرا رہے ہیں لیکن یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ایسے لوگوں سے وابستہ ہونا ان کا قصور ہے تو انہیں سمجھانے اور حق کی طرف مائل کرنے کے قابل نہ ہونا ہمارا بھی تو قصور ہے۔

میں گذشتہ دس بارہ سال سے اہلِ مدارس کو اس طرف متوجہ کررہا ہوں کہ شہر شہر گھومنے کے بعد اور اپنوں کو پرایا مال بنتا ہوا دیکھنے کے بعد جو چیز ہمارے بے مثال و باکمال نظامِ تعلیم میں کم محسوس ہوئی وہ علماء کا زبان وبیان میں عوام کی ضرورت کے مطابق نہ ہوسکنا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے مرتبۂ بلند سے صحابہ کرامؓ کی تربیت کے لئے نزول فرماتے تھے، اسلام میں قیدیوں سے اجنبی زبانیں سیکھ کر رہا کردینے کی تعلیم دعوت کی سہولت کے لئے دی گئی تھی، قرآن کریم کی کتابت پھر بعد میں ان پر اعراب کی زیادتی بندوں کے نفع کے لئے گوارا کی گئی تھی، عقائد کے ثبوت میں نصوص کے علاوہ فلسفے کی مدد بندوں کو گم راہی سے بچانے کے لئے لی گئی تھی اور آج تک مدارسِ اسلامیہ میں زور وشور سے منطق وفلسفہ کی تعلیم معاون ضرورت ہونے کی وجہ سے ہی دی جارہی ہے، رازیؒ کی تفسیری اور غزالیؒ کی تصوفی تحقیقات آسمان سے نازل نہیں ہوئی تھیں اپنے زمانے کے تقاضوں کے ماتحت بندوں کی ہدایت کے لئے وجود میں آئی تھیں، ظاہر ہے کہ سب مقاصد نہیں تھے ذرائع تھے جو بدلے جاسکتے تھے۔ اور بدلے جاسکتے ہیں۔

گذشتہ سو سالوں میں اسلام کے نام پر جو شخصیتیں کھڑی ہوئیں اور رفتہ رفتہ علماء کہلائیں، ان میں سے کسی کی زبان نے اور کسی کے قلم نے وہ کارہائے نمایاں انجام دئے کہ اُن کے نظریات وخیالات عالم گیر تحریک بن گئے، ہزاروں نہیں لاکھوں مسلمان اور غیر مسلم متاثر ہوئے اُن کے پاس دیکھا جائے تو علم صحیح اور مقاصد شریعت کی معرفت بہت کم تھی مگر وسائل کے بھرپور استعمال، ان کی اور عوام کی زبان میں یکسانیت اور علومِ عصریہ سے کچھ واقفیت نے جدید تعلیم یافتہ طبقے کو جوق در جوق اپنا گرویدہ بنالیا، دیکھتے دیکھتے ان لوگوں نے علماء کو چھوڑ کر اُن اسکالرز کو مسیحا ور اہنما تسلیم کرلیا، ان میں سے جو تفہیمِ دین اور دعوتِ اسلام میں غلطیاں کرتے تھے وہ لاکھوں مسلمانوں کو غلطیوں پر چھوڑ گئے اور جو گم راہ تھے وہ ان گنت مسلمانوں کو گم راہوں کے وارث بنا گئے۔

ہمارے پاس علم معتبر ومحقق تھا مگر قوم کی فہم کے مطابق زبان وبیان کی کمی تھی، ہم ان کے انحراف والحاد کی نشان دہی تو بہ آسانی کرسکے مگر ان کے پیچھے جانے والے طبقے کو اپنے دلائل سے مطمئن نہ کرسکے، اس کی وجہ علم کی کمی نہ تھی، اس لئے کہ گذشتہ صدی میں ہندوستان کے علماء کرام کے ذریعہ جو علمی، تحقیقی اور درسی خدمات انجام پائی ہیں ان کی نظیر معاصر اقوام میں کہیں نہیں مل سکتی، میں اُن کا معترف اور مشکور ہوں، وجہ صرف قوم کی زبان اور ماحول کے اعتبار سے گفتگو نہ کرسکنے کی تھی، قرآن نے زبان وبیان کو اہمیت دی ہے، رسولوں کو علم تو آسمانوں

سے دیا مگر دعوت قوم کی زبان میں دلوائی، آج فلاں ڈاکٹر صاحب اور فلاں ڈاکٹر صاحبہ کی باتوں پر ہم فتوے کتنے ہی دیدیں مگر جوان کے دروس میں بیٹھتا اور اسپیچ کو سنتا ہے وہ انہی کو سنتا جا رہا ہے، اُن کے علم میں کتنی ہی غلطیاں سہی اُن کی تفہیم تعلیم یافتہ طبقے کے لئے مانوس ہے، یہ ایک زمینی حقیقت ہے اسے ماننا چاہیے اسے علماء کی تنقیص یا اکابر کی توہین نہیں سمجھنا چاہیے۔

حضرت تھانویؒ نے صاف کر دیا تھا کہ انگریزی تعلیم کی مخالفت زبان اور علوم کی مخالفت کی وجہ سے نہیں ہے اس کے ساتھ لگ کر آنے والے فکری انحراف کی وجہ سے ہے، حضرت کشمیریؒ نے سو سال پہلے دار العلوم دیوبند کی شوریٰ کو دار العلوم میں انگریزی پڑھانے کا مشورہ دیا تھا تو انہیں دنیاداری کا شوق نہیں ہو گیا تھا، بلکہ حالاتِ زمانہ کو دیکھتے ہوئے اُسے گمراہوں کی ریشہ دوانیوں سے باخبر رہنے اور دعوت کے میدان کو مسجد و مدرسہ کے حاضرین سے آگے بڑھا کر کالج وکلب کے سامعین ــــ جب کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اُنہی کی ہے ــــ تک وسیع کرنے کا وسیلہ بنانا ہی ان کا مقصد رہا ہوگا۔

رہ گیا یہ خدشہ کہ جب علماء کو کوئی ڈِگری مل جائے گی تو وہ دیگر راستوں پر نکل پڑیں گے ایک ایسا خدشہ ہے جس سے کوئی کام محفوظ نہیں ہے، دیکھیئے کیا مدرسے کے فارغ علماء میں ایک اچھی خاصی تعداد دنیاداری کے پیچھے پڑھ کر ضائع نہیں ہو جاتی؟ تو کیا اس خطرے کی وجہ سے ہم مدارس بند کر دیں گے؟ کیا دار العلوم دیوبند ہی کے زیر سایہ کبھی طبیہ کالج نہیں چلتا رہا؟ کتنے ہی فضلاء دار العلوم سے فراغت کے بعد حکیم وطبیب بن کر اس میں مشغول ہو گئے، مسند درس وتدریس کو رونق بخش سکے نہ منبر ومحراب کے وارث بن سکے، مگر پھر بھی وہ اس لئے قابلِ قدر تھے کہ اس پیشے کے ذریعہ انہوں نے خدمتِ خلق، دعوت وتبلیغ اور اصلاحِ اُمت کی بھی بہت کچھ خدمت کی تھی جو اگر عالم نہ ہوتے تو ہرگز نہ کر سکتے تھے۔ حضرت محی السنہؒ فرماتے تھے کہ ہمیں معلوم ہے کہ سب طلبہ کام کے نہیں نکلتے مگر ہم اس اُمید پر یہ پتھر بٹور رہے ہیں کہ اس میں کوئی ہیرا ہوگا۔

پھر ہمارا مطالبہ عام دنیاداروں کی طرح یا مرعوب الذہن بعض علماء کی طرح علماء کو گریجویٹ بنانے اور پیشہ ورانہ کورسس پڑھانے کا نہیں ہے، ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ مدرسے ہی کے مبارک ماحول میں اور ذمہ داروں کی نگرانی میں جہاں ہم منطق وفلسفۂ قدیم پڑھا رہے ہیں وہیں سائنس جدید بھی پڑھا دی جائے، فارسی کا کوئی خاص کام نہیں رہ گیا، اردو صحیح ہونے کے بہ قدر فارسی پڑھا کر انگریزی وعلاقائی زبان کو شامل نصاب کیا جائے، حساب کی تعلیم اچھی طرح ہو جائے، اول وآخر تو خود دینی علوم میں پختگی کا سبب بنیں گے، میا تھس کی مفتی کو کتنی ضرورت ہے اور فزیکل سائنس سے واقفیت مفسِر کے لئے کتنی اہم ہے ہم سمجھ سکتے ہیں اور جہاں تک

عالمی ومقامی زبان کا معاملہ ہے تو کارِ دعوت میں زبان سے بڑا کوئی ہتھیار داعی کے پاس نہیں ہوسکتا۔

عصری مضامین میں سے چار مضامین کے لئے نورانی قاعدے سے لے کر عالمیت کے ابتدائی تین سالوں تک ایک مناسب وقت دیا جائے تو دسویں اور اب بارہویں جماعت تک کی تعلیم ہمارے بچّے بہ آسانی حاصل کرسکتے ہیں، میں نے اس کا تجربہ کیا ہے، مناسب وقت دیا جائے تو ٹیچر بہ سہولت یہ کام کر لیتے ہیں، نصابوں کا مواد مختصر بھی کیا جاسکتا ہے صلاحیت بنانے کے لئے مواد سے زیادہ استاد مؤثر ہوتا ہے، اس کے لئے سرمایہ بھی مختص کرنا پڑتا ہے، جیسے عصری اسکولوں میں دھوکہ دینے کے لئے برائے نام دینیات کو شامل کیا جاتا ہے ایسا ہم بھی کریں تو سوائے طفل تسلی کے کچھ نہ ہوگا، اس لئے باقاعدہ نظام اور عمدہ نصاب بنانا ہوگا، تعلیمی سرگرمیاں بڑھانا اور طلبہ میں ذوق پیدا کرنا ہوگا، اس نظام کی ضرورت واہمیت ان کے اور ان کے سرپرستوں کے سامنے اُجاگر کرنا ہوگا، چند کامیاب بیاچ نکلنے کے بعد لوگ خود اس کی طرف مائل ہوں گے، بلکہ اُمید ہے کہ مدارس میں گھٹتی تعداد اور کم ہوتا ہوا رجحان ترقی پذیر ہوگا، مدارس کی اہمیت بڑھے گی درپیش خطرات سے بھی حفاظت ہوگی۔

نوٹ: اس سلسلے میں ایک عملی خاکہ نومبر ۲۰۱۹ء کے اشرف الجرائد میں پیش کر چکا ہوں، اُسے ایک مرتبہ پھر دیکھ لیا جائے نیز اس وقت حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی سرپرستی اور دیگر اکابر علماء ریاست کی نگرانی میں ایک جدید نصابی خاکہ تیار کیا جارہا ہے ممکن ہے کہ رمضان سے قبل متعارف ہوجائے۔

نظمائے مدارس کو نیا تعلیمی سال نئے جذبات اور نئے نصاب کے ساتھ آغاز کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے، مشکلات ومسائل پیش آئیں گے اس کے لئے انشاء اللہ علاقائی سطح پر میٹنگیں رکھی جاسکتی ہیں اور تبادلہ خیال کیا جاسکتا ہے، وہ ہوتا رہے گا، مشکل دور ہوتی رہے گی اور چند برس میں انشاء اللہ ایک مفید اور خوش گوار تبدیلی سامنے آئے گی۔

بقیہ صفحہ (۴۰) سے

سلامتی کے ساتھ رمضان تک پہنچا دیا جائے۔ ہمارے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ اسی ماہ سے رمضان کی آمد کی فکر یں کریں اور خلاف شریعت کاموں سے بچتے ہوئے سنت نبوی پر عمل پیرا ہوں۔ کنڈوں کی غیر دینی رسم اور دعوت سے بچیں اور اس کے علاوہ جو بھی منکرات اس ماہ میں انجام دیے جاتے ہیں اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں اور تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل کریں۔

گوشۂ سیرت

میں نے جہنم میں زیادہ تر خواتین کو دیکھا

از: مولانا الیاس محی الدین ندوی بھٹکلی*

آج سورج گرہن تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جماعت کے ساتھ سورج گرہن کی نماز پڑھائی، نماز کے بعد بعض صحابہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت فرمایا:

اے اللہ کے رسول! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دورانِ نماز ہم نے آپ کو دیکھا کہ آپ کسی چیز کو لینے آگے بڑھے پھر پیچھے ہٹ گئے، کیا بات تھی؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مجھے دورانِ نماز جنت دکھائی گئی، میں نے اس میں سے ایک خوشہ لینا چاہا، اگر میں اس کو لیتا تو تم اس میں سے قیامت تک کھاتے رہتے، لیکن اسی دوران جہنم بھی دکھائی گئی تو میں پیچھے ہٹ گیا، وہ جہنم اتنی خوفناک تھی کہ میں نے اس سے زیادہ بھیانک منظر نہیں دیکھا، میں نے جہنم میں زیادہ تر خواتین کو دیکھا۔

یہ سن کر صحابہؓ نے سوال کیا: اس کی کیا وجہ تھی؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کفر کی وجہ سے۔

صحابہؓ نے پوچھا: کیا اللہ کے ساتھ کفر کی وجہ سے؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہیں،

کفرانِ نعمت یعنی ناشکری کی وجہ سے، عورتیں اپنے شوہروں کی ناشکری کرتی ہیں اور ان کی احسان فراموشی کرتی ہیں، اگر تم ان کے ساتھ زندگی بھر بھی احسان کرتے رہو اور وہ کبھی ایک بار بھی ان کی مرضی کے خلاف تم سے کوئی کام دیکھے تو کہیں گی کہ کبھی آپ نے ہمارے ساتھ بھلائی کا معاملہ ہی نہیں کیا۔

(صحیح البخاری کتاب النکاح: ۵۱۹۷)

(ماخوذ از: مجالس نبوی: ۸۸)

* استاذ تفسیر وحدیث جامعہ اسلامیہ بھٹکل

تذکارِ صحابہؓ

خلیفۂ رابع سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

مولانا عبدالرشید طلحہ نعمانی قاسمی*

مدتِ دراز تک آغوشِ نبوت میں پرورش پانے والے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوتِ اسلام پر سب سے پہلے صدائے لبیک بلند کرنے والے، خوف ناک اور جاں گسل حالات میں سفر ہجرت کی رات فراش نبی کو اپنا بستر بنانے کی سعادت حاصل کرنے والے، غزوہ تبوک میں مملکتِ اسلامیہ کے دارالخلافہ مدینہ طیبہ میں نیابتِ نبی کے فرائض انجام دینے والے، فصاحت و بلاغت کے امام، علم و ادب کے منبع، حکمت و دانائی کے مخزن، جرأت و شجاعت اور ذہانت و فطانت کے حسین امتزاج، جگر گوشۂ رسول فاطمۃ الزہراء کے سرتاج، کمالِ تقویٰ اور غایتِ زہد کے باوجود خندہ رو اور شگفتہ مزاج، سطوت و حکومت، جاہ و حشمت اور سامان کروفر کی بہتات و فراوانی کے باوجود حلۂ خسروی کے بجائے خرقۂ زہد کو زیب تن کرنے والے، تاجِ سروری کے مقابلہ میں عمامۂ نبوی، اور مسند جہاں بانی کی جگہ فرش خاکی کو پسند کرنے والے، خلیفۂ رابع امیر المؤمنین سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ ہیں، جو مختلف خصائل و فضائل کے حامل، متعدد محاسن و اخلاق کے جامع اور کئی ایک کمالات و صفات کے حسین پیکر تھے گویا ان کی ایک زندگی کئی زندگیوں کا خلاصہ و نچوڑ اور حیات کا ہر شعبہ صفتِ کمال کا وہ نادر مرقع تھی؛ جس سے فضیلت و خصوصیت کے بے داغ خدوخال ابھر کر سامنے آتے تھے اور جس کے ہر کمال پر نظریں جم کر رہ جاتی تھیں ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است

مختصر سوانحی خاکہ:

آپ کا نام نامی: علی، لقب: حیدر و مرتضیٰ، کنیت: ابوالحسن اور ابوتراب ہے۔ آپ کی ولادت مشہور قول کے مطابق بعثت سے دس سال قبل شعب بنی ہاشم مکہ مکرمہ میں ہوئی، والدہ ماجدہ نے اپنے والد کے نام پر ''اسد''

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

نام رکھا جسے بعد میں والد نے تبدیل کر کے 'علی' کر دیا۔ آپ کا نسبی تعلق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قریب تر ہے، آپ کے والد ابو طالب اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد ماجد حضرت عبد اللہ دونوں حقیقی بھائی ہیں۔ پورا سلسلہ نسب اس طرح ہے: علی بن ابی طالب بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی، چونکہ ابو طالب کی شادی اپنے چچا کی لڑکی سے ہوئی تھی اس لئے حضرت علیؓ نجیب الطرفین ہاشمی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی چچازاد بھائی تھے۔ آپ کا بدن دوہرا، قدمیانہ، چہرہ روشن ومنور، داڑھی گھنی اور حلقہ دار، ناک بلند، رخساروں پر گوشت، غلافی اور بڑی آنکھیں، پیشانی چوڑی، کاندھے بھاری، بازو اور کلائیاں گوشت سے بھری ہوئیں اور سینہ کشادہ تھا۔ (اسد الغابہ)

ابو طالب چوں کہ کثیر العیال اور معاشی تنگی سے پریشان تھے، قحط وخشک سالی نے اس مصیبت میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا، اس لئے رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محبوب چچا کی عسرت سے متاثر ہو کر حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ ہم کو اس مصیبت و پریشان حالی میں چچا کا ہاتھ بٹانا چاہئے؛ چنانچہ حضرت عباسؓ نے حسب ارشاد جعفر کی کفالت اپنے ذمہ لی اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہِ انتخاب نے علیؓ کو پسند کیا؛ چنانچہ وہ اس وقت سے برابر حضور پر نور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہے۔ (تاریخ اسلام)

عہدِ نبوت وخلافت میں کارہائے نمایاں:

تقریباً دس سال کی عمر میں اللہ رب العزت نے معرفتِ حق اور پھر قبولِ حق کی دولتِ گراں مایہ سے سرفراز فرمایا، پھر کیا تھا؟ دن ورات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیتِ صادقہ میں گزرنے لگے، مشوروں کی مجلسوں میں، تعلیم وارشاد کے مجمعوں میں، کفار ومشرکین کے مباحثوں میں معبودِ حقیقی کی یادوں میں غرضیکہ ہر قسم کی صحبتوں میں شرکت کی سعادت سے بہرور ہونے لگے، خود حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ میں محسنِ انسانیت کے پیچھے ایسے چلتا تھا جیسے اونٹ کا بچہ اونٹ کے پیچھے چلتا ہے۔

مدینہ طیبہ آنے کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ کو دامادی کا شرف بخشا؛ اس طرح جگر گوشۂ نبی حضرت فاطمۃ الزہراء آپ کے نکاح میں آئیں۔ آپ مدنی زندگی کے تمام غزوات میں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ راست بنے رہے، غزوہ بدر، احد، خندق، بنی قریظہ، اور حنین وغیرہ میں آپ نے عزم وہمت جرأت وشجاعت اور بے باکی وجواں مردی کے ایسے جوہر دکھلائے کہ اسد اللہ آپ کے نام کا جزو لاینفک ہو گیا، ان کے علاوہ متعدد سرایا بھی آپ کی ماتحتی میں بھیجے گئے جنہیں آپ نے کامیابی کے ساتھ سرانجام دیا اور قدم قدم پر اسلام کی سربلندی واشاعت میں بھرپور حصہ لیا، صلح حدیبیہ کا معاہدہ آپ ہی نے تحریر کیا، معرکۂ خیبر کی فتح و

ظفرمندی تو آپ ہی کے نام سے معنون ہے، اسی طرح مکہ پر چڑھائی کے وقت جاسوس کا خط لے کر جانے والی عورت کا پردہ بھی آپ ہی نے فاش کیا، غزوہ تبوک کے موقع پر آپ ہی نے جانشین نبی کے فرائض انجام دیئے اور جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دارِفانی سے پردہ فرما گئے تو آپ کے غسل اور تجہیز وتکفین کی سعادت بھی آپ ہی کے حصہ میں آئی۔ علاوہ ازیں خلفاءِ ثلثہ کے بابرکت زمانوں میں بھی آپ ان اکابر کے دست راست اور مشیرِ خاص رہے، وفاتِ نبی کے بعد بنو ہاشم خلافت کو اپنا حق سمجھنے لگے، حتی کہ رؤساء قریش نے تو حضرت کو آگے آنے کا باصرار مشورہ دیا؛ مگر حضرت علیؓ نے دانائی اور دوراندیشی سے اس عظیم فتنہ کا خاتمہ فرمایا عہد فاروقی میں ایران پر چڑھائی کے وقت آپ ہی نے حضرت عمرؓ کو مدینہ نہ چھوڑنے کا صائب مشورہ دیا، ایک مرتبہ کسی شخص نے پیش روخلفاء کے زمانہ میں پرامن حالات اور آپ کے زمانہ میں بپا شورش کا شکوہ کیا تو یوں ارشاد فرمایا کہ ہمیں مشورہ دینے والے تم ہو اور انہیں مشورہ دینے والے ہم تھے۔

حضرت عثمانؓ کی وفات کے بعد تقریباً ایک ہفتہ تک مسندِ خلافت خالی رہی، کوئی بھی نامور شخصیت بارِ حکومت اٹھانے کو تیار نہ ہوئی ان حالات میں انصار ومہاجرین کے بزرگ جمع ہوکر آپ کے پاس تشریف لائے اور خلافت کے اس عظیم منصب کو ـــــ جس کے بلاشبہ آپ ہی حق دار تھے ـــــ قبول کرنے پر اصرار کیا، ابتداً آپ نے انکار کیا اور فرمایا کہ مجھے امیر بننے کے بہ نسبت وزیر بننا زیادہ پسند ہے؛ لیکن حالات کا بگاڑ اور امت کا اجماع دونوں ہی آپ کی شخصیت پر جمع ہوگئے، تب آپ کی ہمت عالیہ نے ۲۴/ذی الحجہ ۳۵ھ کو امت کی باگ ڈور سنبھالی اور پیش روخلفاء کی سنت کے عین مطابق مسلمانوں کے مجمع سے خطاب فرمایا: جس میں حمد وثنا کے بعد ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کی جان ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہے اس لئے تم سب متحد ومتفق ہوکر رہو، کیوں کہ حقیقی مسلمان وہی ہے جس کے زبان وہاتھ سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اس کے احکامات کی خلاف ورزی سے بچو، جہاں کہیں بھلائی کی بات دیکھو اسے قبول کرو اور جہاں بدی نظر آئے اس سے پرہیز کرو۔

جن حالات میں حضرت علیؓ سریر آرائے خلافت ہوئے وہ غیر معمولی قسم کے نہایت پرآشوب حالات تھے، ایک طرف قصاص عثمانؓ کا سنگین مسئلہ درپیش تھا تو دوسری طرف امیر معاویہؓ کی معزولی نے ایک نئی شورش برپا کررکھی تھی، اس کے بعد بھی یکے بعد دیگرے سخت حالات آتے رہے؛ مگر عزم واستقامت کا یہ کوہِ ہمالیہ انتہائی جرأت وشجاعت کے ساتھ دیوانہ واران کا مقابلہ کرتا رہا بالخصوص جنگ جمل اور جنگ صفین (جو مشاجراتِ صحابہؓ کے عنوان سے معنون ہے) میں جس زبردست دوراندیشی اور حکمت ودانائی سے کام لیا وہ واقعۃً آپ ہی کا حق تھا۔

ان پریشان کن حالات کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اصلاحات کا کام جاری رکھا۔آپ اپنے عاملوں کی نگرانی کرتے تھے۔لوگوں کے ساتھ شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ بیت المال کے دروازے غریبوں کے لیے کھلے تھے۔اس میں جو رقم آتی،آپ ضرورت مندوں میں تقسیم فرمادیتے تھے۔آپ خود بہت تجربہ کار جنگ آزما تھے ۔جنگی معاملات کو اچھی طرح سمجھتے تھے، چنانچہ خلیفہ بننے کے بعد آپ نے فوجی چھاؤنیاں نہایت کثرت سے قائم کیں۔ایران کی طرف شورش اور بغاوت کی وجہ سے آپ نے اصطخر میں قلعہ حسن زیاد بنوایا؛ تاکہ خطرے کے وقت عورتوں اور بچوں کی حفاظت ہوسکے۔جنگی تعمیرات کے سلسلے میں دریائے فرات پر پل بنوایا۔یمن میں اسلام کی روشنی آپ ہی کی کوششوں سے پھیلی تھی۔آپ کے خلیفہ بننے کے بعد ایران اور آرمینیہ کے نئے نئے مسلمان مرتد ہوگئے تو آپ نے ان کی سرکوبی فرمائی، چنانچہ ان میں سے اکثر نے توبہ کی اور مسلمان ہوگئے۔اسی طرح خارجیوں کا قلع قمع کیا۔سبائی گروہ میں سے کچھ آپ رضی اللہ عنہ کو خدا کہنے لگے تھے،آپ نے انہیں عبرتناک سزائیں دیں اور ان کے گھروں کو ڈھادیا۔

جنگ جمل:

حضرت عثمانؓ کی المناک شہادت کے وقت ام المؤمنین سیدہ عائشہؓ مکہ معظّمہ میں تھیں جب انہوں نے یہ اندوہناک خبر سنی تو غمگین ہوئیں، کبار صحابہؓ نے قاتلین عثمانؓ سے قصاص کا مطالبہ کیا، حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ غم واندوہ کی تصویر بنے ہوئے ام المؤمنین کی خدمت میں مکہ مکرمہ پہونچے، باہمی مشورے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ بصرہ پہنچ کر حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا پرزور مطالبہ کیا جائے کیونکہ وہاں اسباب ووسائل مہیا تھے اس لئے حضرت عائشہؓ اس قافلہ کے ہمراہ تشریف لے گئیں جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ اُم المؤمنین کے وجودِ باجود کے بناء پر لوگ ٹکراؤ اور تضاد سے باز رہیں گے،لیکن جب یہ قافلہ بصرہ پہنچا تو وہاں عثمان بن حنیف (جو حضرت علیؓ کی جانب سے بصرے کا گورنر تھا) ایک لشکر کی قیادت کرتا ہوا مقابلہ کے لئے آدھمکا؛لیکن شکست سے دوچار ہونا پڑا، اس کو پکڑ کر حضرت عائشہؓ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو لجاجت کے ساتھ معافی مانگی اور باعزت رہا کردیا گیا، ان حالات کا علم جب حضرت علیؓ کو ہوا تو آپ ایک لشکر کے ساتھ بصرہ پہونچے اور اُم المؤمنین سے بصرہ آمد کا مقصد پوچھا آپ نے فرمایا کہ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ مظلوم خلیفہ عثمانؓ بن عفان کے قتل کا بدلہ لیا جائے حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں بھی اسی حق میں ہوں کہ قاتلانِ عثمانؓ سے قصاص لیا جائے مگر ابھی حالات سازگار نہیں ہے، سب سے پہلے مملکتِ اسلامیہ میں امن وسکون کی فضاء قائم ہونے دیں اور اتفاقِ رائے کے ساتھ استحکامِ خلافت کا اہم کام نمٹ جائے۔

حضرت عائشہؓ نے اس بات پر اتفاق کرلیا؛ مگر کچھ شر پسند عناصر نے مل کر رات کی تاریکی میں اہل بصرہ پر حملہ کردیا اور مشہور یہ ہوا کہ حملہ کرنے میں فریق مخالف نے پہل کی تھی دونوں فریق ایک دوسرے سے بدظن ہوگئے اور تاریخ کا وہ اندوہناک واقعہ پیش آیا جو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا چنانچہ بدحواسی کے عالم میں جنگ شروع ہوئی اور طرفین سے دس ہزار افراد موت کی آغوش میں چلے گئے، حضرت عائشہؓ جس اونٹ پر سوار تھیں اس کی ٹانگیں کاٹ دی گئیں، حضرت طلحہؓ وزبیرؓ بھی اسی کے نتیجہ میں شہید ہوگئے، جب جنگ ختم ہوئی تو حضرت علیؓ نے ام المؤمنین کو پورے اعزاز واکرام کے ساتھ چالیس خواتین کے جلو میں مدینہ منورہ روانہ کیا اور مال کی بہت بڑی مقدار ان کے ہمراہ کردی کہ راستہ میں تکلیف نہ ہو۔

جنگ صفین:

جب حضرت علیؓ جنگ جمل سے فارغ ہوئے تو حضرت امیر معاویہؓ کو اپنی بیعت پر آمادہ کرنے کے لئے پیغام بھیجا، انھوں نے بیعت کرنے سے صاف انکار کردیا ساتھ ہی انہیں شام کی گورنری سے معزول کرنے کا حکم صادر فرمایا؛ لیکن حضرت معاویہؓ نے تسلیم نہیں کیا، حضرت علیؓ نے ۸۰/ ہزار مجاہدین کی قیادت کرتے ہوئے شام کی طرف پیش قدمی کی، جب حضرت معاویہؓ کو پتہ چلا تو وہ بھی ساٹھ ہزار فوج لے کر دریائے فرات کے کنارے مقام صفین پر خیمہ زن ہوگئے، حضرت علیؓ کی فوج بھی دریا عبور کرکے میدان میں اتر آئی، امیر معاویہؓ کا کہنا تھا کہ حضرت علیؓ نے قاتلینِ عثمانؓ کو اپنے یہاں پناہ دے رکھی ہے کیونکہ حضرت علیؓ کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے میں بلوائیوں نے بھی پیش قدمی کی تھی اور حضرت علیؓ کے لئے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ قتلِ عثمانؓ میں ملوث افراد کی شناخت کیسے کی جائے؟ ان کا تعین کرکے شرعی شہادت کی بنیاد پر ان کی گرفت یا ان پر قصاص کا اجراء ایک دشوار گذار امر بن چکا تھا، حضرت علیؓ کا کہنا تھا کہ قتل عثمانؓ میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے؛ بلکہ میں نے خود متعدد بار بلوائیوں کو سمجھایا، میرے بیٹے قصر عثمانی کا پہرہ دیتے رہے وغیرہ، تین ماہ مسلسل دونوں فوجیں آمنے سامنے رہیں، مصالحت کے متعدد بار کوششیں کی گئیں جو نتیجہ خیز ثابت نہ ہوسکیں، ۳۷/ ہجری ماہ شعبان کے اوائل میں دونوں فوجوں کے مابین خون ریز جنگ شروع ہوئی اور کئی دن بغیر کسی غلبۂ فریق کے جاری رہی، طرفین کے ہزاروں آدمی موت کی آغوش میں پہونچادئے گئے، بالآخر حضرت عمرو بن العاصؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کو مشورہ دیا کہ جنگ روکنے کے لئے میری تجویز یہ ہے کہ نیزوں پر قرآن اٹھالیا جائے اور کتابُ اللہ کو فیصل وحکم بنالیا جائے۔

جب مدمقابل قرآن حکیم کو سامنے دیکھا تو خاموش ہوگئے لڑائی سے ہاتھ روک لئے اور صلح کے لئے طرفین

سے ایک نمائندہ مقرر کردیا گیا، حضرت امیر معاویہؓ کی جانب سے حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابوموسی اشعریؓ مصالحت کے لئے آگے آئے؛ مگر حضرت علیؓ کی فوج سے 12 ہزار افراد ان الحکم الاللہ کا نعرہ لگا کر الگ ہوگئے جو خارجی کے نام سے معروف ہوئے اور یہیں سے امت میں افتراق وانتشار کا سلسلہ شروع ہوگیا، حکمین میں شامیوں (حضرت معاویہؓ) کی جانب سے مقرر کردہ حکم حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت معاویہؓ کو معزول کرنے پر راضی نہ ہوئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں حکم اپنی اپنی رائے پر ڈٹے رہے اس موقع پر پھر کچھ صحابہؓ درمیان میں آگئے اور طئے کیا کہ دونوں اپنے اپنے علاقوں پر حکومت کریں کوئی دوسرے کے معاملہ میں دخل اندازی نہ کرے۔

آپ کی سیاسی خدمات پر ایک نظر:

سابقہ تفصیلات سے اتنا معلوم ہوگیا کہ حضرت علی مرتضیٰؓ کو اندرونی شورشوں اور خانگی جھگڑوں کو دبانے سے اتنی فرصت نہ مل سکی کہ وہ فتوحاتِ اسلامیہ کے دائرہ کو وسیع کرسکیں، تاہم آپ بیرونی امور سے کبھی غافل نہ رہے چنانچہ سیستاں اور کامل کی سمت میں بعض عرب خودمختار ہوگئے تھے ان کو قابو میں کر کے قدم آگے بڑھایا اور ۳۸ھ میں بعض مسلمانوں کو بحری راستہ سے ہندوستان پر حملہ کرنے کی اجازت دی، علاوہ ازیں انتظام مملکت میں حتی الوسع حضرت فاروق اعظمؓ کے نقشِ قدم کی پیروی کی، اعمال کے محاسبے کا فاروقی نظام بحال کیا، رات کو شہروں کی گشت کا معمول بنایا، آپ سے پہلے جنگل سے کسی قسم کا مالی فائدہ نہیں لیا جاتا تھا آپ کے عہد میں جنگلات کو بھی محاصل ملکی کے ضمن میں داخل کیا گیا علاوہ ازیں حضرت علیؓ نے مسلمانوں کی اخلاقی نگرانی کا بھی نہایت سختی کے ساتھ خیال رکھا، مجرموں کو عبرت انگیز سزائیں دیں، ایران اور آرمینیہ میں بعض نومسلم عیسائی مرتد ہوگئے تھے حضرت علیؓ نے نہایت سختی سے ان کی سرکوبی کی پھر خارجیوں اور ان سبائیوں کی بھی خوب خوب خبر لی، جنہوں نے حضرت علیؓ کی شان میں شدتِ غلو سے کام لیا ان سب کے باوجود آپ ایک بڑے تجربہ کار جنگ آزما تھے، جنگی امور میں آپ کو بھرپور بصیرت حاصل تھی، اس لئے اس سلسلہ میں آپ نے بہت سی فوجی اصلاحات کیں جو آپ کی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی کی بین دلیل ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ:

بعض وہ حضرات جو مزاجِ قدرت سے ناآشنا اور اسلام کی ہمہ گیریت وجامعیت سے ناواقف ہیں وہ خلافتِ راشدہ کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، پہلے دور کو اسلام کی ترقی وپیش قدمی اور دوسرے دور کو زوال وتنزلی سے تعبیر کرتے ہیں، پہلے دور کا امام؛ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کو مانتے ہیں جب کہ دوسرے دور کی

قیادت حضرت عثمان وعلیؓ کے سپرد کرتے ہیں ، مفکر اسلام علی میاں ندویؒ نے اس تقسیم کو جسارت وجرأت قرار دیتے ہوئے ارقام فرمایا: ”میرے نزدیک یہ چاروں حضرات فرداً فرداً خلافتِ نبوی کا مظہر اتم اور مصداق کامل تھے، ذاتی فضائل ومناقب اوران کی بناء پر تفاوتِ درجات کو الگ کر کے خلافتِ راشدہ کا مزاج اوراس کی روح ان میں سے ہر ایک میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھی، میرے نزدیک اسلام کی زندگی میں پیش آنے والے تمام ادوار ومراحل کی نمائندگی خلافتِ راشدہ کے اس مختصر سے دور میں —— جو 40 سال سے متجاوز نہیں —— کردی گئی ہے اور ہر آنے والے ناگزیر دور کے لئے اس میں رہنمائی کا سامان ہے“۔

آغازِ کار اور اقبال وترقی کے زمانہ میں کس استقامت اور ایمان ویقین کا مظاہرہ کرنا چاہئے اس کی رہنمائی ہم کو ابوبکرؓ کی حیات طیبہ سے حاصل ہوتی ہے، عروج وشباب اور امن ونظام کے زمانہ میں کس استقامت اور ایمان ویقین کا مظاہرہ کرنا چاہئے اس کی رہنمائی ہم کو فاروق اعظمؓ کے دور خلافت سے ملتی ہے، مخالفتوں، شورشوں، فتنوں، بے نظمی اور انتشار کے وقت کس ثبات واستقامت، کس پامردی اور دلیری اور کس ایمان ویقین کی ضرورت ہے اس کا نمونہ ہم کو حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی زندگی میں ملتا ہے“۔

وفات:

مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت خوارج کے ہاتھوں ہوئی، یہ وہی گروہ ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں میں شامل تھا، بعد میں اس پارٹی میں اختلافات پیدا ہو گئے اور خوارج نے اپنی جماعت الگ بنالی۔ چناں چہ سترہ رمضان المبارک 40 / ہجری بروز جمعہ فجر کے وقت خارجی عبدالرحمن ابن ملجم مرادی اپنے دوساتھی شبیب اور وردان کے ہمراہ جامع مسجد کوفہ پہنچا اور تینوں مسجد کے ایک کونے میں چھپ گئے۔جس وقت آپؓ نماز فجر کے لئے تشریف لے آئے تھے اس وقت شبیب نے آپؓ پر پہلا وار کیا اوراس کے بعد عبدالرحمٰن ابن ملجم نے دوسرا وار کیا، واردن یہ دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا شبیب بھی وار کرنے کے بعد بھاگ نکلا؛ مگر خارجی عبدالرحمن ابن ملجم مرادی پکڑا گیا۔

حضرت علیؓ نے اپنے بھانجے حضرت ام ہانیؓ کے بیٹے حضرت جعدہؓ کو نماز پڑھانے کا حکم دیا اس دوران سورج طلوع ہو چکا تھا،لوگ آپؓ کو زخمی حالت میں گھر لے گئے اور خارجی عبدالرحمن ابن ملجم مرادی کو آپؓ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپؓ نے اس بدبخت سے پوچھا کہ تجھے کس چیز نے مجھے مارنے پر آمادہ کیا؟ خارجی عبدالرحمن ابن ملجم مرادی نے آپؓ کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اس تلوار کو چالیس روز تک تیز کیا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اس سے وہ شخص مارا جائے جو خلق کے لئے شر کا باعث ہو آپؓ نے فرمایا میں دیکھ رہا ہوں تو اس تلوار سے مارا جائے گا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وفات سے پہلے کچھ وقت مل گیا؛ جسے آپ نے اپنے بیٹوں کو وصیت کرنے میں صرف کیا، جاں کنی کے اس عالم میں بھی آپ نے جو باتیں ارشاد فرمائیں، وہ آب زر سے لکھنے کے لائق ہیں، آپ نے حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو بلوایا اور ان سے فرمایا: "میں تم دونوں کو اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں، دنیا کے پیچھے ہرگز نہ لگنا خواہ دنیا تم سے بغاوت ہی کیوں نہ کردے۔ جو چیز تمہیں نہ ملے، اس پر رونا نہیں ہمیشہ حق بات کہنا، یتیموں سے شفقت کرنا، پریشان کی مدد کرنا، آخرت کی تیاری میں مصروف رہنا، ہمیشہ ظالم کے دشمن اور مظلوم کے حامی رہنا اور کتاب اللہ کے احکامات پر عمل کرتے رہنا۔ اللہ کے دین کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے مت گھبرانا۔

آپؓ شدید زخمی حالت میں تھے یہاں تک کہ 21 / ویں رمضان المبارک کی شب کا دو تہائی گذرنے پر مزید طبیعت خراب ہوگئی اور اسی اثناء کلمہ شہادت کا ورد کرتے ہوئے اپنی جان خالق حقیقی کے سپرد کردی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون

(بقیہ صفحہ ۸ سے)

انسان زندگی میں مال کی تگ ودو کرتا ہے یہ جس طرح جائز اور مباح ہے اسی طرح اس کی بقاء وتحفظ کی فکر کرنا اور ورثاء کو اس سے نفع اُٹھانے کے لئے چھوڑ جانا یہ بھی بڑا کارِخیر ہے اس لئے کہ اس طرح مال قرابت داروں پر خرچ ہوگا اور صلہ رحمی اور حسنِ سلوک کا اجر بھی ملے گا۔

روایت کے اخیر میں نیکی کی ایک ایسی مثال دی گئی جس طرف عموماً خیال وذہن نہیں جاتا جو اگرچہ مباح اور جائز عمل ہے، لیکن نیت کی وجہ سے وہ نیکی اور طاعت کا درجہ حاصل کرلیتا ہے جیسے بیوی جسمانی اور دنیوی راحت اور لذت کا ذریعہ ہے لیکن اللہ کی رضا اور خوش نودی کے لئے اگر بیوی کے منھ میں لقمہ بھی دیتا ہے تو اس پر بھی اجر وثواب ملتا ہے۔

بعض اللہ کے بندے مختلف دینی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے نظر آتے ہیں لیکن ماں باپ پر، اہل وعیال پر، ضرورت مند بھائی بہنوں اور رشتہ داروں پر خرچ کرنے میں بخیل اور کنجوس ہوجاتے ہیں حالاں کہ اس خرچ میں دوہرا اجر وثواب ہے کہ ضرورت مند کی حاجت برآری بھی ہے اور صلہ رحمی کا ثواب بھی۔ اس حدیث کا یہ بھی سبق ہے کہ ہمارا خرچ کرنا منشاء شریعت کے مطابق ہو نہ کہ خواہش نفس کے جذبہ کے ساتھ اس لئے کہ نفس بہت مرتبہ نیکی کے راستہ سے اسراف اور حقوق تلفی تک پہونچا دیتا ہے، جب کہ شریعت انسان کو کامران وبامراد کرتی ہے۔ اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی

اصلاحی مضامین

حیا ہی زندگی ہے!

تحریر: فرزانہ خورشید

حیا معاشرے کا حسن، زندگی کا سکون، ایمان کی شاخ، اخلاق کا نچوڑ، اسلام کا نور، رب تعالیٰ کا حکم اور معاشرتی وسماجی نکھار ہے۔ حیا کا لفظ حیات سے ہے یعنی حیا زندگی ہے، دل کی اصلاح، زندگیوں میں سنوار، معاشرے کا امن حیا کے بغیر ناممکن ہے۔ حیا ہی بے راہ روی اور بے حیائی سے روکتی ہے۔ حیا نہ صرف لباس اور نظر میں؛ بلکہ زندگی کے ہر عمل میں نظر آنے والی خوبی کا نام ہے۔

آج لوگوں میں گناہوں کی طرف حد سے بڑھتی ہوئی رغبت کا سبب دلوں سے حیا کا رخصت ہو جانا ہے۔ حیا اتنی ہو کہ جب دل اپنے رب کی نافرمانی کی طرف لپکے تو اس کے ڈر اور خوف کی وجہ سے لرز اٹھے اور پیچھے ہٹ جائے مگر گناہ کر کے اگر احساس ندامت اور شرمندگی بھی نہ ہو تو اس بات کی علامت ہے کہ ایمان بھی باقی نہیں بچا ہے، مومن کی شان حیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمانِ عالی شان ہے" حیا جز و ایمان ہے" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی عملی زندگی میں بھی سب سے زیادہ شرم وحیا کے پیکر تھے۔ آج ہمارے معاشرے کلچر اور ہماری روایت میں اسلام کی جھلک کم غیر مسلم معاشرے کی مشابہت زیادہ دکھائی دے رہی ہے۔ ہم جس ٹرینڈ، رواج، فیشن کی پیروی میں لگے ہیں وہ ہمارے مذہب کے خلاف ہے۔ ایک باحیا معاشرہ مسلم معاشرے کی پہچان ہے۔ جس معاشرے سے اگر بدقسمتی سے حیا نکل جائے تو اس قوم کا اخلاقی زوال یقینی ہے۔ معاشرے کی پاکدامنی کا انحصار حیا پر ہے، پرامن معاشرے کی بنیاد حیا ہے۔

اگر حیا میں کمی رونما ہونے لگے اور جن کاموں سے حیا یا نظر کے پھسل جانے کا خطرہ لاحق ہو اس کا سد باب نہ کیا جائے اور اس کی روک تھام کے لیے کوشش بھی نہ کی جائے بلکہ اس کمی کو موڈرنزم کا نام دے کر اسلامی ہدایات واحکامات کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے، اپنی مرضی کے بنائے ہوئے اصولوں اور ضابطوں کو اپنانا اہم سمجھا جانے لگے تو ایسے معاشرے میں پاکیزگی اور بلند ترین اخلاقی معیار کا قیام کیسے ممکن ہے؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہر امت کے اخلاق کی ایک خاص خوبی ہوتی ہے اور میری امت کے لوگوں کے اخلاق کی وہ خاص نمایاں خوبی حیا ہے۔ ایمان کا دارومدار حیا پر ہے جس دل میں ایمان زیادہ ہو وہ دل اور اس کی زندگی بھی حیا والی ہوگی۔ آج ہم اس خوبی کو اگر دقیانوسی سوچ قرار دے دیں تو پھر ہمیں معاشرے کی بگڑتی وگرتی ہوئی اخلاقی صورتحال اور بداخلاقی و بدتہذیبی کے وحشت ناک واقعات پر ماتم کرنے کا کوئی حق نہیں!

ہم نے اپنے دین اسلام کے اصولوں کو بھلا دیا معاشرے کا امن وسکون جس میں پوشیدہ ہے ہم نے اسے خود اپنے ہاتھوں سے مٹا دیا، اسلام حیا داری کا حکم دیتا ہے اسے قومی سطح پر فروغ دینا، حاکمِ اعلیٰ اور سربراہوں کی ذمہ داری ہے۔ ہمارا کلچر اسلامی احکامات سے غافل ہو رہا ہے، مغرب کی نقالی کی ریس میں لگا ہے اپنے رب سے منہ موڑ کر، اس کے احکامات کو توڑ کر اپنی من پسند زندگی کے طریقوں کو منزلِ مقصود سمجھ بیٹھا ہے۔ مومن کی عزت جو خدا اور رسول کی اطاعت میں ہے اسے اپنے گلے کا طوق سمجھ کر خود کو مصیبت میں گرفتار کر چکا ہے۔

حیا کی قوت مومن کو نیکی کرنے اور گناہوں اور نافرمانی والے کاموں سے بچنے کی قوت فراہم کرتی ہے تنہائی میں اپنے رب سے ڈرنے کا مادّہ پیدا کرتی ہے،؛ رب سے حیا یہ ہے کہ وہ اس سے باخبر اس کی ہر نقل و حرکت کو دیکھ رہا ہے اور فرشتوں سے حیا یہ ہے کہ اس کی تمام حرکات وسکنات کو لکھ رہے ہیں اور بندوں سے حیا مروت کی وہ قسم ہے جس کے سبب اپنے ہاتھ اور اعضاء سے کسی مومن کو تکلیف دینے میں شرمندگی محسوس کرے، غیر اخلاقی، دل دکھانے والے رویوں سے اجتناب کرے اور رشتوں کے تقدس کا احترام کرے۔

حیا کا حکم نہ صرف عورتوں پر بلکہ ہر فرد پر لازم ہے، اس کے معنی چھوڑ دینا، اور رُک جانا ہے یعنی ہر اس کام سے خود کو روک لیں جو اللہ عزوجل کے حکم کے منافی ہو۔ ہر اس شے، بات، عمل اور طریقے سے خود کو بچائیں، حیا کریں ہر اس کام سے جو اس کی ناراضگی وغضب کا باعث ہو۔ جہاں تک ہو سکے خود کو اپنے رشتے، اپنے معاشرے اور اپنے ملک کو ایسی تمام آلودگیوں سے صاف کرنے کی کوششیں شروع کر دیں، جس پر ایمان کے جانے اور حیا کے مٹنے کا اندیشہ ہو۔ ہر شخص اپنے دائرہ اختیار میں حاکم و ذمہ دار ہے اپنی زندگی میں حیا کے رنگ شامل کر کے اس کے رنگوں سے اپنے گھر اور ماحول کو سجا دیں اور حیا کی جڑ کو اس قدر مضبوطی دیں کہ مغرب کی ہوا اور شیطان کی سازش بھی اسے اکھاڑ نہ سکے۔ ایمان کی حفاظت کے ساتھ اپنی حیا کی سلامتی کے لیے بھی سرگرداں رہے جو طریقِ زندگی ہمارے رب کا حکم اور ہمارے نبی کی سنت ہے اسے اپنا لیں، ہمارے معاشرے کے بگاڑ کی بحالی اور قوم کی عزت اسلام اور اس کی پیروی میں ہے۔ اسے اگر ہم نے چھوڑا تو پھر رسوائی، بربادی اور ذلت کو روکنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

اصلاحی مضامین

کیا ہم نے سفرِ حقیقی کو بُھلا دیا؟

مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کی فکر انگیز تحریر

پیش کش: مفتی محمد ندیم الدین قاسمی*

آپ کو جب کبھی کہیں دور، اور اجنبی مقام کے سفر کا اتفاق ہو، تو آپ اس کے لئے کتنی تیاریاں اور اہتمام کرتے ہیں، ریل کے کیا کیا اوقات ہیں، کتنا کرایہ ہے، دورانِ سفر کتنی چیزوں کی ضرورت پڑے گی، راستہ میں خورد ونوش کی کیا صورتیں ہوں گی، منزلِ مقصود پر پہنچ کر ٹھہرنے کا کیا بندوبست رہے گا، وہاں پہنچ کر کن چیزوں کی ضرورت پیش آئے گی، عدمِ موجودگی میں گھر کی دیکھ ریکھ کون کرے گا؟ یہ اور اس قسم کے دیگر سوالات آپ کے قلب ودماغ میں ضرور گردش کرتے ہوں گے؛ لیکن جو سفر آپ کے لئے سب سے زیادہ قطعی ویقینی ہے، جس سفر سے بچنا ممکن ہی نہیں، جس سفر کا اختیار کرنا آپ کے اختیار وارادہ کے ماتحت نہیں، جو سفر آپ کو ایک بارگی اور بغیر سابق اطلاع کے کرنا ہوگا، جس سفر میں آپ کے لئے اپنے عزیز واقارب کو بطورِ ملازم رکھنا ممکن ہی نہ ہوگا، جو سفر آپ کو ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک ملک سے دوسرے ملک نہیں؛ بلکہ ایک عالم سے نکال کر چشم زدن میں دوسرے عالم میں پہنچا دے گا، آپ نے کبھی اس سفر کی اہمیت پر غور کیا ہے؟ آپ نے کبھی اس سفر کی تیاریاں کی ہیں؟ کبھی اس سفر کی دشواریاں آپ کے دل میں خوف پیدا کرتی ہیں؟ کبھی اس سفر کی سہولتیں آپ کے دل میں شوق بڑھاتی ہیں؟ آپ نے کبھی سب سے اچھے اور سب سے سچے مسافر کا قول سنا ہے کہ جو کوئی اس سفر کے خاتمہ، یعنی اللہ کے دربار میں حاضری کو دوست رکھے گا، اور دنیا میں اس سفر کی تیاریاں کی ہوگی، تو اللہ خود اپنے دربار میں اس کی حاضری کا مشتاق ہوگا، اور جو اس سفر کے خاتمہ کو ناگوار سمجھے گا، اور دنیائے فانی میں "وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ" کی عملی تصویر ہوگا، اللہ خود اس کی حاضری کو ناپسند فرمانے لگے گا۔ اس ارشاد کو سن کر آپ کے دل نے کیا اثر لیا؟ آپ کی عقل نے آپ کو کیا مشورہ دیا؟ آیا اس سفر کو بھلائے رکھنا دانش مندی ہے، یا اسے یاد رکھ کر ہر وقت اس کی تیاریوں میں لگے رہنا؟ آیا اس منزل کو اپنے لئے مانوس ومالوف بنالینا، یا اس راہ کی

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

دشواریوں کو اپنے حق میں بڑھاتے رہنا؟ آیا اس سفر کے سب سے بڑے رہنما کی ہدایتوں پر اپنے امکان بھر عمل کرکے، آگ کے شعلوں اور انگاروں کو اپنے حق میں گل وگلزار بنالینا، یا غفلت، ضد اور سرکشی سے کام لے کر منزل کی آسائشوں سے لطف اٹھانے کی قابلیت ہی اپنے میں باقی نہ رکھنا؟ آیا موجودہ زندگی کو اس برتر زندگی کا محض پیش خیمہ ومقدمہ سمجھنا" آج" کی لذتوں میں مشغول ومنہمک ہوکر" کل" کے خیالات کو وہم وخرافات کے درجے پر رکھنا؟ آج ذرا ہم ان سوالات پر سنجیدگی کے ساتھ سوچیں اور فیصلہ کریں کہ کیا ہم نے اس یقینی سفر کی تیاریاں کی ہیں؟ کیا ہم خدا کے دربار میں حاضری کے لئے مکمل تیار ہیں؟ کیا ہم نے ہمارے بہترین رہبر (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ہدایتوں پر عمل کیا ہے؟ کیا ہمارے" لیل ونہار" خدا کی ناراضگی میں سر ہوتے ہیں یا خدا کی خوشنودی کی حصول میں؟ اگر ہم نے اب تک اس سفر کی تیاری نہیں کی ہے، تو ہمیں فکر مند ہونا چاہئے۔

(بقیہ صفحہ ۳۶ سے)

✷ دنیا میں آنے والی ہر ہستی کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور ایک دن خود اس دنیا کو بھی فنا ہونا ہے یہ کب ہوگا؟ اس کا علم سوائے اللہ کے کسی کو نہیں۔ ✷ موت کے بعد قیامت قائم ہونے تک انسانوں کی روح دوسرے عالم میں ہوگی جہاں فرشتے مومنین کو بشارت سنائیں گے اور اُن سے اچھا معاملہ کریں گے اور بے ایمان لوگ سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ ✷ جب اللہ کے حکم سے قیامت قائم ہوگی تو ساری دنیا یک دم سے فنا ہوجائے گی۔ ✷ اللہ تعالیٰ بندوں کو دنیا میں کئے ہوئے اعمال کا حساب لینے کے لئے دوبارہ زندہ کرے گا اور اپنی بارگاہ میں سب کو جمع فرمائے گا، ہر بندے کو اس کے اچھے بُرے کا صلہ اور بدلہ دے گا۔ ✷ مومنین کے لئے ہمیشہ جنت میں رہنے اور کافرین کے لئے ہمیشہ جہنم میں رہنے کا فیصلہ سنائے گا۔ اس کو اسلام میں عقیدۂ آخرت کہتے ہیں۔

بے دینی، ضلالت وگم راہی کے اس دور میں ہر مسلمان مرد وعورت کے لئے ان عقائدِ اسلام کو جاننا، ان کی روشنی میں اپنے افکار ونظریات کا جائزہ لینا اور اپنی نسلوں کو دین وایمان کی سلامتی دینا نہایت ضروری ہے۔ اگر مسلمان ان عقائد کے مفاہیم ومطالب کو اچھی طرح سمجھیں اور بچوں کے دل ودماغ میں اچھی طرح بٹھائیں تو اُمید ہے کہ آئندہ زندگی میں کسی گم راہی کا شکار نہ ہوں گے۔

اَللّٰھُمَّ اھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا

اصلاحی مضامین

عقائدِ ثلاثہ

توحید، رسالت اور آخرت

بہ قلم: مولانا خواجہ نصیرالدین قاسمی*

توحید، رسالت اور آخرت اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہیں، حق تعالیٰ شانہ نے کتابِ مبین کی کئی سورتوں میں ان سے متعلق مضامین کو قدرت کی نشانیوں اور عقلوں کو اپیل کرنے والی دلیلوں سے خوب خوب واضح فرمایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ان عقائد کی حقیقت کو سمجھانے میں حق تفہیم ادا فرمادیا؛ لیکن بندگانِ خدا میں کچھ وہ ہیں جنھوں توحید باری کو سرے سے قبول ہی نہیں کیا، کچھ وہ ہیں جنھوں نے توحیدِ ذاتی کو تو مانا ہے لیکن توحیدِ صفاتی میں لغزش کھا گئے اور حق سبحانہ وتعالیٰ کی پاک ذات کے ساتھ کئی شرکاء بنا بیٹھے، کچھ وہ ہیں جنھوں نے نہ توحید کو قبول کیا نہ نبیِ آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کو مانا، کیوں کہ ان کا زعم یہ تھا کہ بشریت اور نبوت جمع نہیں ہوسکتے، نتیجہ یہ ہوا کہ صاحبِ نبوت کے ساتھ ساتھ کتابِ الٰہی کے بھی منکر ہوئے کیوں کہ کتابِ الٰہی ان کی نبوت کا بیّن ثبوت تھی۔ کچھ وہ ہیں جنھوں نے دنیوی زندگی ہی کو ابدی اور ہمیشہ کی زندگی تصور کیا اور موت کے بعد دوبارہ اُٹھائے جانے، بارگاہِ رب میں حاضری اور اعمال کی پیشی، حساب کتاب، جزاء وسزا وغیرہ تمام اُمورِ آخرت کا انکار کیا، کچھ وہ ہیں جنھوں نے انبیاء وصلحاء کو زمرۂ بشریت سے نکال کر مقامِ الوہیت پر فائز کردیا اور صفاتِ الٰہیہ کا مجسم مظہر بنادیا۔ الغرض لوگوں کے درمیان دین ـــــ جو پیغمبر اول سیدنا آدم علیہ السلام سے پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ایک ہی تھا ـــــ مختلف خیالات میں بدل گیا، آخرت میں حق تعالیٰ شانہ اختلافِ ادیان کا فیصلہ فرمائیں گے۔ اب بھی اس قسم کے خیالات رکھنے والے بندوں کی کمی نہیں ہے؛ ان کے بالمقابل ایک بڑی تعداد ایسی بھی ہے جنھوں نے ''کلمۂ اسلام'' تو پڑھ لیا اور زمرۂ مسلمین میں شامل ہوگئے اور ان کی بہ دولت ان کی نسلیں بھی مسلم کہلائی جانے لگیں لیکن اِن آبائی مسلمانوں میں بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جو عقائدِ اسلام کی حقیقت اور ان کے صحیح مفاہیم ومطالب سے واقف ہیں، جس کی وجہ سے کئی ایک شرکیہ مراسم میں مبتلاء ہیں اور ان

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

کی اولادیں بھی بہت جلد بے دینی وگم راہی کا شکار ہوجاتی ہیں اس لئے خیال ہوا کہ آسان انداز میں اسلام کے بنیادی عقائد پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ ایک آدمی کے مسلمان ہونے اور اسلام پر باقی رہنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ عقیدۂ توحید، عقیدۂ رسالت اور عقیدۂ آخرت کے مطالب کو جانے اور سمجھے تاکہ شرکیات وکفریات سے بچ سکے اور اپنے فکروخیال کو صراط مستقیم پر قائم رکھ سکے۔ چناں چہ

پہلا بنیادی عقیدہ عقیدۂ توحید ہے: عقیدۂ توحید اسلام کی بنیاد کا پتھر اور اس کی روح ہے۔ عقیدۂ توحید میں اِن تین اُمور پر یقین رکھے۔

✷ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ایک اکیلے ہونے کا اقرار کرنا اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرانا۔ ✷ اس کو اپنی تمام صفات میں کامل ومکمل اور بے مثل ماننا۔ ✷ ہر قسم کے نقص وعیب سے اس کی ذات کو پاک تسلیم کرنا۔ اس کو عقیدۂ توحید کہتے ہیں۔

دوسرا بنیادی عقیدہ عقیدۂ رسالت ہے: حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے بندوں کو فلاح وبہبود اور ابدی سعادت کی راہ دکھانے کے لئے کچھ خاص بندوں کا انتخاب فرمایا اور اُنھیں دستورِ حیات دے کر ان کی طرف بھیجا تاکہ بندے ان کی رہنمائی میں زندگی بسر کرنے، اغوائے شیطانی واَہوائے نفسانی سے محفوظ رہنے میں کامیاب ہوجائیں۔

اِن خاص بندوں کے تعلق سے اِن باتوں پر یقین رکھنا ضروری ہے:

✷ ایسی تمام نفوسِ قدسیہ کو پیغمبر برحق ماننا اور ان کی لائی ہوئی تعلیمات کی تصدیق کرنا۔ ✷ اس مبارک سلسلہ کے آخری تاجدار نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بھی رسول برحق تسلیم کرنا اور آپ کی شریعت کی اتباع وپیروی کو لازم جاننا۔ ✷ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل کی ہوئی کتاب ''قرآن مجید'' کو برحق ماننا اور آخری کتاب تسلیم کرنا۔ ✷ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو آخری نبی ماننا اور اس کے بعد کسی اور نبی کو نہ ماننا۔

اس کو اسلام میں عقیدۂ رسالت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عقیدۂ توحید کی طرح عقیدۂ رسالت کا ماننا اور اقرار کرنا بھی ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے۔

تیسرا بنیادی عقیدہ عقیدۂ آخرت ہے: یہ ایسا عقیدہ ہے جو انسان کو عملِ صالح پر اُبھارتا ہے اور دین پر قائم رکھتا ہے نیز معاصی سے بچنے اور بدانجامی سے نجات پانے میں معاون ومددگار رہے۔ اس میں ان باتوں کا یقین رکھنا ضروری ہے۔ (بقیہ صفحہ ۳۴ پر)

فضائل وآداب

ماہ رجب اور اسلامی تعلیمات

مفتی صادق حسین قاسمی*

اسلامی مہینوں میں ساتواں مہینہ رجب کا ہے، جو اپنی ایک خصوصی شان رکھتا ہے، اور شروع ہی سے یہ محترم مہینوں میں شمار کیا جاتا رہا ہے۔ ماہِ رجب کی عظمت، اس کی حقیقت اور اس ماہ کے تاریخی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اس میں انجام دی جانی والی خرافات کا مختصر حال ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

ماہِ رجب کی وجہ تسمیہ:

رجب عربی زبان میں ترجیب سے بنا ہے اور ترجیب کے معنی تعظیم وتکریم کے آتے ہیں، اور رجب کے ساتھ مرجّب کا لفظ بڑھا کر بھی اسی معنی کی نسبت کا لحاظ کیا جاتا ہے، کیوں کہ مرجب کے معنی تعظیم کیے ہوئے کے آتے ہیں، یہ مہینہ سال کے ان چار مہینوں میں سے ایک ہے جن مہینوں کی اسلام میں ابتدا سے ہی تعظیم وتکریم کی گئی ہے۔ (ماہِ رجب فضائل واحکام: ۷) اسی طرح حضرت انس ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ماہِ رجب کی وجہ تسمیہ دریافت کی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لانہ یترجب فیہ خیر کثیر لشعبان ورمضان۔ یعنی اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں شعبان اور رمضان کے لیے بہت سارے خیر کی تیاری کی جاتی ہے، یعنی رجب تیاری کے معنی میں ہے۔ (فضائل شہر رجب لابی محمد الخلال: ۷۴) اس کے علاوہ بھی علماء نے ماہِ رجب کی وجہ تسمیہ بیان کی ہے لیکن ان تمام میں سب سے زیادہ مناسبت رکھنے والی وجہ وہ تعظیم وتکریم کے معنی والی ہے۔

فضائلِ ماہ رجب:

ماہِ رجب کے مختلف فضائل مروی ہیں، اس کی بڑی فضیلت یہ ہے کہ یہ شروع ہی سے حرمت والے مہینوں میں سے ایک رہا ہے، جس کی حرمت وعظمت کے قائل دور جاہلیت میں بھی تھے اور زمانہ جاہلیت میں بھی رجب کے مہینہ میں خون ریز لڑائیاں اور جنگیں بند ہوجاتی اور کشت وخون کا بازار سرد ہوجاتا۔ قرآن کریم نے جن چار مہینوں کو اشہر حرم قرار دیا ان میں سے ایک رجب بھی ہے۔ اشہر حرم کو حرمت والا دو معنی کے اعتبار سے کہا گیا، ایک تو اس لیے کہ ان میں قتل وقتال حرام ہے، دوسرے اس لیے کہ یہ مہینے متبرک اور واجب الاحترام ہیں، ان

* مدیر ماہنامہ ''الاصلاح''، کریم نگر

میں عبادات کا ثواب زیادہ ملتا ہے، ان میں سے پہلا حکم تو شریعت اسلام میں منسوخ ہو گیا، مگر دوسرا حکم احترام و ادب اور ان میں عبادت گذاری کا اہتمام اسلام میں باقی ہے۔ (معارف القرآن: ۴/ ۳۷۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا کہ: بے شک زمانہ پھر اپنی اسی حالت پر آ گیا ہے جس پر اللہ نے آسمان وزمین کو پیدا کیا تھا، سال بارہ مہینہ کا ہوتا ہے، ان میں چار مہینے حرمت والے ہیں، تین لگا تار یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجہ، اور محرم، جب کہ چوتھا رجب مضر (مضر قبیلہ کی طرف منسوب ہے جو اس کی بہت تعظیم کیا کرتے تھے) ہے جو جمادی (الاخریٰ) اور شعبان کے درمیان ہے۔ (بخاری:) ماہِ رجب کا مہینہ جب شروع ہوجاتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعاؤں میں ایک دعا کا اضافہ ہوجاتا اور دعا کیا کرتے تھے: اللهم بارك لنا فی رجب و شعبان وبلغنا شهر رمضان۔ (فضائل الاوقات للبیہقی: ۲۶) اے اللہ! ہمارے لیے رجب اور شعبان کے مہینہ میں برکت دے اور ہمیں رمضان کے مہینہ تک پہنچا دے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رجب کی پہلی رات کو دعا کی قبولیت والی راتوں میں قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ ماہِ رجب میں روزہ رکھنے کی بھی خاص فضیلت بیان فرمائی ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ: ہمارے اصحاب نے فرمایا کہ مستحب روزوں میں سے عظمت والے مہینوں کے روزے بھی ہیں، اور وہ ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب کے مہینے ہیں۔ (ماہِ رجب کے فضائل واحکام: ۳۲) امام بیہقیؒ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ: جنت میں ایک نہر ہے، جس کو نہر رجب کہا جاتا ہے جو دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھی ہے، پس جو کوئی رجب کے مہینہ کو ایک روزہ رکھے گا اللہ اس کو اس نہر سے سیراب کرے گا۔ (فضائل الاوقات: ۲۲) بہر حال رجب کا مہینہ بڑی عظمتوں والا ہے، اشہر حرم میں داخل ہے جس کی حرمت وعظمت ہمیشہ باقی رہے گی اور اس کا احترام کرنا ہر ایک کے لیے ضروری ہوگا۔

ماہِ رجب اور واقعۂ معراج:

ماہِ رجب کی خصوصیتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس مہینہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج کا عظیم الشان سفر پیش آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آسمان پر تشریف لے گئے، اور انعامات الٰہیہ سے نوازے گئے۔ واقعہ معراج سیرتِ رسول کا ایک حیرت انگیز اور تاریخی معجزہ ہے۔ جس کے اندر بے شمار اسباق و ہدایات اور پیغامات پوشیدہ ہیں۔ اللہ تعالی نے اپنے نبی سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رات ہی کے کچھ حصے میں جسم وروح کے ساتھ، بیداری کی حالت میں عالم بالا کی سیر کرائی اور اپنے قرب کا اعلی ترین مقام عنایت فرمایا، جنت وجہنم کا مشاہدہ کروایا، نیکوں اور بدوں کی سزا وجزا کا معائنہ کروایا، نبیوں سے ملاقات ہوئی، ہر جگہ آپ کی عظمت ورفعت کا چرچہ کروایا، رحمتوں کی بارش فرمائی اور انعامات والطاف سے خوب نوازا اور امت کے لیے عظیم الشان تحفہ نماز کی شکل میں عطا کیا، اور

قیامت تک کے لیے انسانوں کو اپنے معبود اور خالق سے رابطہ کرنے اور اپنے مالک سے راز و نیاز کرنے کا سلیقہ بخشا۔ غرض یہ کہ واقعۂ معراج بے شمار سبق آموز پہلوؤں اور عبرت خیز واقعات کا مجموعہ ہے۔ واقعہ معراج کے ماہِ رجب ہی میں پیش آنے کے سلسلہ میں تاریخی اعتبار سے اختلاف بھی ہے۔ مولانا ادریس کاندھلویؒ لکھتے ہیں: رہا یہ امر کہ کس مہینہ میں ہوئی اس میں اختلاف ہے۔ ربیع الاول یا ربیع الاخر، یا رجب یا رمضان یا شوال میں ہوئی پانچ قول منقول ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ رجب کی ستائیسویں شب میں ہوئی۔ (سیرت مصطفی: ۱/ ۲۸۸) مولانا قاضی سلیمان منصور پوریؒ لکھتے ہیں کہ: ۲۷ رجب ۱۰ نبوت کو معراج ہوئی۔ (رحمۃ للعالمین: ۱/ ۹۶)۔

ماہِ رجب کے خرافات:

ماہِ رجب کی حقیقت وہی ہے جو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان کی، کسی بھی چیز کی عظمت کو ماننے میں اور اس کی قدر دانی میں حدود سے تجاوز کرنا قطعاً جائز نہیں ہے۔ لیکن لوگوں کا بھی عجیب معاملہ ہے کہ جن چیزوں کی قدر کرنی چاہیے ان کی تو کرتے نہیں اور اپنی طرف سے غیر ضروری اور خلافِ شریعت چیزوں کو ایجاد کر کے اسے دین سمجھتے ہیں۔ بہت سے مہینوں میں بدعات و خرافات کا ایک سلسلہ رہتا ہے۔ چناں چہ ماہِ رجب کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا، اس میں بھی قسم قسم کے خرافات کو ایجاد کیا گیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے خلاف مختلف کاموں کو شروع کیا گیا۔ اس وقت ہمارے معاشرہ میں ماہِ رجب میں سب سے بڑی بدعت جو جاری ہے وہ "کنڈے" ہے۔ رجب کی ۲۲/ تاریخ کو کنڈوں کے عنوان سے کھیر پوری بنوائی جاتی ہے اور اس کی دعوت ہوتی ہے، بڑے اہتمام کے ساتھ لوگ اس کو انجام دیتے ہیں، نماز، روزہ وغیرہ کا اہتمام نہ ہو کوئی پرواہ نہیں لیکن کنڈوں کی دعوت نہیں چھوڑی جاتی اور یہ سب حضرت جعفر صادقؒ کی فاتحہ و نیاز کے نام سے کی جاتی ہے۔ جب کہ تاریخی اعتبار سے یہ بالکل بے بنیاد بات ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس کی حقیقت یہ ہے کہ: ۲۲ رجب ۶۰ھ کو کاتب وحی سیدنا معاویہ بن ابوسفیانؓ نے اسلام اور مسلمانوں کی پچاس سال تک خدمت کرنے کے بعد وفات پائی تھی۔ روافض نے جس طرح امیر المومنین سیدنا فاروق اعظمؓ کی شہادت کی خوشی میں ان کے مجوسی قاتل ابولولو فیروز کو بابا شجاع کہہ کر عید مناتے ہیں، اسی طرح وہ سیدنا معاویہؓ کی رحلت کی خوشی میں ۲۲ رجب کو یہ تقریب مناتے ہیں۔ لیکن پردہ پوشی کے لیے ایک روایت گھڑ کر جناب جعفر بن محمدؒ کی طرف منسوب کر دی ہے تاکہ راز فاش ہونے سے رہ جائے اور دشمنانِ معاویہ چپکے سے ایک دوسرے کے یہاں بیٹھ کر یہ شیرینی کھالیں اور یوں اپنی خوشی کا اظہار کرے۔ (اسلامی مہینے اور ان کا تعارف: ۲۲۰) حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ: کونڈوں کی مروجہ رسم اہل سنت والجماعت میں محض بے اصل، خلاف شرع اور بدعت

ممنوعہ ہے، کیوں کہ بائیسویں رجب نہ حضرت امام جعفر صادقؒ کی تاریخ پیدائش ہے اور نہ تاریخ وفات، حضرت امام جعفر صادقؒ کی ولادت ۸ رمضان ۸۰ھ میں ہوئی اور وفات شوال ۱۴۸ھ میں ہوئی، پھر بائیسویں رجب کی تخصیص کیا ہے اور اس تاریخ کو حضرت جعفر صادقؒ سے کیا خاص مناسبت ہے؟ ہاں بائیسویں رجب کو حضرت معاویہؓ کی تاریخ وفات ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس رسم کو محض پردہ پوشی کے لیے حضرت جعفر صادقؒ کی طرف منسوب کیا گیا، ورنہ درحقیقت یہ تقریب حضرت معاویہ کی وفات کی خوشی میں منائی جاتی ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۳/۲۸۱) یہ ہے کنڈوں کی تلخ حقیقت۔ مگر لوگ اعتقاد کی کمزوری، ایمان ویقین کی کمی اور توہم پرستی کی وجہ سے اس غلط رسم میں مبتلا ہیں، بلکہ بعضوں کا اعتقاد یہاں تک پہنچا ہوا ہے کہ اگر کنڈے نہیں کیے گئے تو مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا، کاروبار ٹھپ پڑ جائے گا، گھر میں مصیبتیں نازل ہوں گی وغیرہ وغیرہ۔۔۔ اللھم احفظنا۔ جب کہ یہ سب بے دینی اور بے علمی کا نتیجہ ہے۔ اوران رسموں کا انجام دینا سرار جہالت اور ناواقفیت کی علامت ہے۔ عوام کے ان غلط اعمال میں مبتلا ہونے میں دین کے جاننے والوں کا بڑا قصور ہے کہ جو حق کو چھپا کر تن پرستی کے لیے قوم کو بدعات وخرافات کے دلدل میں ڈھکیل رہے ہیں اور دانستہ یا نادانستہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت اور آپ کی تعلیمات کے خلاف برسر پیکار ہیں۔

رجب کے کنڈوں کے علاوہ بھی کچھ چیزیں اس مہینہ میں انجام دینی ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ خاص طریقے پر نماز پڑھنا، ۲۷ رجب کا روزہ رکھنا، ۲۷ ویں شب کو جاگنا اور عبادت کا اہتمام کرنا، اس کو دین کا ضروری حصہ سمجھا جارہا ہے۔ ستائیسویں رجب کے روزہ کو ایک ہزار روزوں کے برابر سمجھتے ہیں، اسی واسطے اس کو ہزاری کا روزہ کہتے ہیں مگر یہ فضیلت شرعی اعتبار سے معتبر سند سے ثابت نہیں۔ محدثین نے اس سلسلہ میں پیش کی جانے والی روایات کو کمزور اور ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ (ماہِ رجب کے فضائل واحکام: ۹۹) حضرت مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ لکھتے ہیں کہ: ستائیسویں رجب کے بارے میں جو روایات آئی ہیں وہ موضوع اور ضعیف ہیں، صحیح اور قابل اعتماد نہیں، لہٰذا ستائیسویں رجب کا روزہ عاشورا کی طرح مسنون سمجھ کر ہزار روزوں کا ثواب ملے گا اس اعتقاد سے رکھنا ممنوع ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ ستائیسویں رجب کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔ البتہ کوئی سنت اور ہزاری روزہ کے اعتقاد کے بغیر صرف نفل روزہ رکھے تو منع نہیں۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۷/۲۷۴)

آخری بات:

بہر حال ماہِ رجب اسلامی مہینوں میں ایک عظیم مہینہ ہے۔ رجب کا مہینہ رمضان المبارک کی آمد کا پیش خیمہ ہے، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعاوں میں اس کا اہتمام شروع ہوجاتا کہ۔۔۔۔ (بقیہ صفحہ ۲۱ پر)

احکام ومسائل

بینک انٹرسٹ کے مصارف

بہ قلم: مفتی امانت علی قاسمی*

سود کی حرمت قرآن وحدیث میں جس قدر بیان کی گئی ہے اس سے ہر ایمان والا واقف ہے، قرآن کریم میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (سورہ بقرہ: ۲۷۸) ''اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اسے چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو'' اور جو لوگ سود سے باز نہیں آتے ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جنگ کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا: فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ (سورۃ البقرۃ: ۲۷۹) ''لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ''۔ اسی طرح حدیث میں سود کی قباحت کے سلسلے میں حضرت عبید اللہ بن حنظلہؓ کی حدیث ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سود کا ایک درہم جو انسان جان بوجھ کر کھاتا ہے ۳۶ مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ سخت ہے (سنن دار قطنی، کتاب البیوع، ۳/ ۴۰۳، حدیث نمبر: ۲۸۴۳) اسی طرح حضرت ابو ہریرۃؓ کی حدیث ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ سود کے ستر اجزا ہیں جن میں سب سے ہلکا یہ ہے کہ آدمی اپنی ماں سے زنا کرے۔

(سنن ابن ماجہ، باب التغلیظ فی الربا، ۳/ ۷۷۳، حدیث نمبر: ۲۲۷۳)

مال حرام کا حکم

مال حرام کا حکم یہ ہے کہ اگر اس کا مالک معلوم ہے اور وہ بلا عوض حاصل کیا گیا ہے جیسے سود، رشوت، چوری وغیرہ کا مال تو اس کے مالک کو واپس کرنا ضروری ہے۔ اگر مالک وفات پا گیا ہے تو اس کے ورثہ کو لوٹانا ضروری ہے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو بلا نیت ثواب مستحق زکوۃ کو صدقہ کرنا ضروری ہے اور اگر وہ بالعوض حاصل کیا گیا ہے جیسے حرام ملازمت وغیرہ کے ذریعہ سے حاصل ہوا تو مالک کو واپس کرنا درست نہیں ہے؛ بلکہ اس کو بلا نیت ثواب صدقہ کرنا ہی ضروری ہے۔ باقی مال حرام کسی کو استعمال کے لیے دینا جائز نہیں اور نہ اس کی وجہ سے وہ مال پاک ہوگا۔ اسی طرح حرام رقم اصول وفروع کو صدقہ نہیں کر سکتے ہیں لہذا باپ بیٹے میں سے کوئی مستحق ہو تب بھی اسے حرام رقم نہیں دی جاسکتی ہے۔

* استاذ ومفتی دار العلوم وقف دیوبند

سود کے مصارف

سود کے مال کے بھی علماء نے تین مصارف بیان کیے ہیں ایک تو یہ کہ اگر مالک معلوم ہوتو مالک کو واپس کردیا جائے دوسرے یہ کہ اگر مالک معلوم نہ ہو یا مالک کو واپس کرناممکن نہ ہوتو بلانیت ثواب صدقہ کردیا جائے تیسرے یہ کہ بعض حضرات نے رفاہی کاموں میں بھی لگانے کی اجازت دی ہے اسی وجہ سے بعض حضرات رفاہی بیت الخلاء حتی کہ مسجد کے بیت الخلاء میں لگانے کی بھی اجازت دی ہے، اسی طرح سڑک بنانے، یا مسافر خانے بنانے کی بھی اجازت دی ہے؛ جب کہ بعض علماء کی رائے ہے کہ سود کی رقم کو اس طرح صدقہ کرنا ضروری ہے کہ خود صاحب مال کو اس سے کسی طرح کا انتفاع نہ ہو جب کہ رفاہی کاموں میں لگانے میں خود صاحب مال بھی اس سے منتفع ہوسکتا ہے، مسجد کے بیت الخلاء میں لگانے کی صورت میں خود بھی اس مال سے مستفید ہوسکتا ہے، اس طرح مال حرام سے یا سودی مال سے فائدہ اٹھانا لازم آئے گا، خاص کر مسجد جیسے مبارک اور مقدس جگہ کے کسی حصے میں بھی ناپاک مال یا حرام مال کا لگانا مناسب نہیں ہے؛ اس لیے سودی رقم کو مسجد کے بیت الخلاء میں لگانا بھی درست نہیں ہے۔ العرف الشذی میں ہے:احدھما ائتمار أمر الشارع و الثواب علیه، والثانی : التصدق بمال خبیث ، والرجاء من نفس المال بدون لحاظ رجاء الثواب و اما رجاء الثواب من نفس المال فحرام بل ینبغی لمتصدق الحرام أن یزعم بتصدق المال تلخیص رقبته ولا یرجوا الثواب منه، بل یرجوه من ائتمار أمر الشارع

(العرف الشذی شرح سنن الترمذی:۱/۳۸)

بینک انٹرسٹ کا مصرف

سود کی ایک صورت بینک انٹرسٹ ہے، بینک کے سیونگ اکاؤنٹ میں جو پیسے جمع کیے جاتے ہیں اس پر بینک کی طرف سے جو متعین اضافہ ملتا ہے وہ بھی سود ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ بینک سے وہ اضافی رقم وصول کرلی جائے اور بلانیت ثواب صدقہ کردی جائے، البتہ اگر کسی طرح بینک کو ہی واپس کرنا پڑے جس میں بظاہر اپنا کوئی فائدہ وصول نہ کیا گیا ہوتو یہ بھی جائز ہے۔ویردونها علی اربابها ان عرفوهم و الا تصدقوا بها لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق اذا تعذر الرد علی صاحبه (رد المحتار، کتاب الحظر والاباحة، فصل فی البیع، ۹/۵۵۳) قال شیخنا و یستفاد من کتب فقهائنا کالهدایة وغیره ان من ملک بملک خبیث ولم یمکنه الرد الی المالک فسبیله التصدق علی الفقراء -قال والظاهر ان المتصدق بمثله ینبغی ان ینوی به فراغ ذمته ولا یرجو به المثوبة (معارف السنن: ابواب الطهارة، ۱/۳۴) بینک سے

نکالنے کے ضروری ہونے کے سلسلے میں مفتی نظام الدین صاحب لکھتے ہیں: سود کا پیسہ بینک میں چھوڑ دینے سے خطرہ بظن غالب ہے کہ وہ لوگ اپنے مذہبی کاموں کے فروغ میں خرچ کریں یا ایسے کاموں میں خرچ کریں جس سے مسلم قوم کو بہ حیثیتِ قوم مسلم نقصان پہونچے اس لیے بہ نیت حفاظت قوم مسلم یہ حکم دیا جاتا ہے کہ سود کے نام سے جو روپیہ ہے اس کو بینک میں نہ چھوڑا جائے؛ بلکہ وہاں سے نکال کر شرعی ضابطہ کے مطابق اپنی ملک سے نکال دیا جائے۔(منتخبات نظام الفتاوی ۳/ ۹۱۱۲)

بینک سے سودی رقم نکالنے سے پہلے صدقہ کرنا

بینک کے انٹرسٹ کا حکم معلوم ہو گیا ہے کہ اس کو بلا نیت ثواب صدقہ کرنا ضروری ہے؛ لیکن بسا اوقات آدمی اپنے اکاؤنٹ میں موجود سودی رقم کو رہنے دیتا ہے اور اپنے پاس سے اتنی مقدار بلا نیت ثواب صدقہ کرنا چاہتا ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر سود کی رقم اکاؤنٹ میں آچکی ہے اس طور پر کہ اگر کھاتہ دار نکالنا چاہے تو بلا رکاوٹ کے نکال سکتا ہے اس صورت میں گویا اس سودی رقم پر اس کا قبضہ ہو چکا ہے؛ اس لیے بلا نکالے بھی وہ رقم صدقہ کر سکتا ہے ہاں اگر فکس ڈپازٹ کرایا ہے اور ابھی اصل رقم بھی نہیں نکال سکتا ہے تو اس فکس ڈپازٹ کی بنا پر جو سود ملنے والا ہے جب تک اصل رقم کے ساتھ سودی رقم پر قبضہ نہ ہو جائے اس وقت تک صدقہ کرنا درست نہیں ہے؛ اس لیے کہ جب تک انٹرسٹ کی رقم پر قبضہ نہیں ہو جاتا ہے اس وقت تک اس متعین رقم کا تصدق واجب نہیں ہوتا ہے اب اگر نکالنے سے پہلے تصدق کر دے تو واجب ہونے سے پہلے تصدق کرنا لازم آئے گا جو کہ درست نہیں ہے اس لیے جب انٹرسٹ کی رقم اکاؤنٹ میں اس طرح منتقل ہو جائے کہ اکاؤنٹ ہولڈر اس کو نکال سکتا ہے تب تصدق کرے، اسی طرح جس کو صدقہ کرنا ہے اس کے اکاؤنٹ میں آن لائن ٹرانسفر کر دے تو بھی تصدق درست ہو جائے گا۔

انٹرسٹ کی رقم سے بچوں کی فیس ادا کرنا

بینک انٹرسٹ کی رقم کا حکم بلا نیت ثواب تصدق ہے؛ اس لیے اگر بچے کے والدین غریب مستحق زکوۃ ہوں تو ان کے بچوں کو بھی یہ رقم بلا نیت ثواب دی جا سکتی ہے جس سے وہ اپنے اسکول کی فیس ادا کریں اسی طرح اگر انٹرسٹ کا حامل شخص خود ہی فیس وصول کر دے تو بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے، جس طرح زکوۃ میں رقم دینے کے بجائے کوئی سامان خرید کر دے دے تو بھی زکوۃ ادا ہو جاتی ہے لیکن بہتر ہے کہ خود فیس ادا نہ کرے؛ بلکہ بچوں کو دے دے تاکہ بچے یا ان کے ماں باپ اپنے طور پر فیس ادا کر دیں اس لیے کہ خود فیس ادا کرنے میں کسی حد تک سودی رقم کو استعمال کرنا لازم آتا ہے۔ اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ مال دے کر اپنا ذمہ فارغ کر لے۔

انکم ٹیکس اور ویٹ ٹیکس میں انٹرسٹ کی رقم دینا

بینک انٹرسٹ کا حکم ماقبل میں ذکر کر دیا گیا ہے کہ بلا نیت ثواب صدقہ کرنا ضروری ہے اپنے کسی مصرف میں استعمال میں لانا جائز نہیں ہے؛ اسی لیے حکومت کی طرف سے جن چیزوں کا فائدہ براہ راست صارف کو ملتا ہے اور اس پر حکومت کی طرف سے ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اس طرح کے ٹیکس میں بینک انٹرسٹ کی رقم لگانا جائز نہیں ہوگا؛ اس لیے کہ اس صورت میں خود سود سے فائدہ اٹھانا لازم آئے گا جیسے ہاؤس ٹیکس، یا واٹر ٹیکس وغیرہ البتہ غیر شرعی سرکاری اور غیر واجبی ٹیکس میں انٹرسٹ کی رقم دینا جائز ہے اور غیر شرعی کا معیار یہ ہے کہ ایسا ٹیکس جس کی بظاہر کوئی منفعت ہم کو حاصل نہ ہو رہی ہو مثلاً انکم ٹیکس، سیل ٹیکس ویٹ ٹیکس وغیرہ اس میں بینک انٹرسٹ دینا جائز ہے۔ (الرباء، مولانا عبید اللہ اسعدی، ص: ۲۸۷) یہاں پر ایک فرق کرنا ضروری ہے کہ اس طرح کے ٹیکس میں انٹرسٹ کی وہی رقم دے سکتے ہیں جو سرکاری بینکوں سے حاصل ہوں؛ اس لیے کہ اس صورت میں مالک کو رقم واپس کر کے اپنے ذمہ کو بری کرنا لازم آئے گا یعنی اس صورت میں سرکار کا پیسہ سرکار کو ادا کر کے آدمی حرام مال سے اپنا دامن بچاتا ہے؛ اس لیے یہ صورت جائز ہے لیکن اگر پراویٹ بینک کا سود ہو تو اس صورت میں ان ٹیکسوں میں یہ رقم نہیں دے سکتے ہیں؛ اس لیے کہ یہاں پر مالک کو واپس کرنا لازم نہیں آرہا ہے؛ بلکہ اپنے کسی مفاد کے لیے غیر مالک کو دینا لازم آرہا ہے جو جائز نہیں ہے۔ البتہ آج کل یہ موضوع حل طلب ہو گیا ہے اس لیے کہ مکمل طور بینک پراویٹ نہیں ہوتے ہیں؛ بلکہ اس میں حکومت کا شیئر بھی ہوتا ہے اس لیے یہ ایک دشوار موضوع بن جاتا ہے ایسی صورت میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غلبہ کا اعتبار کر لیا جائے اگر حکومت کے شیئر زیادہ ہیں تو اس صورت میں ایسے بینکوں کو یہ رقم دینا جائز ہوگا لیکن اگر زیادہ شیئر پراویٹ ہے تو پھر ان بینکوں کے انٹرسٹ کو مذکورہ ٹیکسوں میں دینا جائز نہیں ہوگا۔ اس سلسلے میں مفتی نظام الدین صاحب لکھتے ہیں: پہلے چند فقہی ضابطے نقل کر دیے جاتے ہیں انہی سے جواب خود بخود متفرع ہو جائے گا۔

(۱) والحاصل أنه علم ارباب الاموال وجب رده عليهم و الا فان علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه (شامی ۴/ ۱۳۰)

(۲) وشمل الرد حكما ما فى جامع الفصولين: وضع المغصوب بين يدى مالكه وان لم يوجد حقيقة القبض (شامی ۵/ ۱۱۶)

(۳) غصب دراهم انسان من كيسه ثم ردها فيه بلا علم برى و كذا لو سلمه اليه بجهة

أخری کھبة أو ابداع أو شراء و کذا لو أطعمه فأکله (شامی ۵/۱۱۶)

(۴) ویردونها (ای الاموال الخبیثة) علی أربابها ان عرفوهم و الا تصدقوا بها لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق اذا تعذر الرد علی صاحبه (شامی ۵/۲۴۷)

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ اسٹیٹ بینک یا مرکزی حکومت کے اور جتنے بینک ہیں ان سے سود کی جو رقم ملے اس کو اگر مرکزی حکومت کے کسی غیر شرعی ٹیکس میں دے دے تو ذمہ بری ہو جائے گا جیسے انکم ٹیکس وغیرہ اور اگر مرکزی حکومت کے ٹیکس کے علاوہ صوبائی یا میونسپل بورڈ وغیرہ کے کسی مقامی یا نجی غیر شرعی ٹیکس وغیرہ میں دیدیا جائے تو ذمہ بری نہ ہوگا؛ بلکہ ایسی صورت میں اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے غرباء ومساکین پر تصدق کردینا لازم ہوگا۔ تصدق بغیر نیت ثواب کے علاوہ کہیں اور کام میں خرچ کردینا درست نہ ہوگا۔

(منتخبات نظام الفتاوی: ۳/۱۲۸)

جی ایس ٹی میں بینک انٹرسٹ کی رقم لگانا

آج کل حکومت ہر چیز پر جی ایس ٹی اٹھارہ فیصد وصول کرتی ہے جو غیر شرعی ہے اور غیر واجبی ہے اس لیے کہ ہر خام مال پر جو حکومت ٹیکس وصول کرتی ہے وہ علحدہ ہے پھر جب مال تیار ہوکر مارکٹ میں آجاتا ہے تو دوبارہ اس پر جی ایس ٹی کے نام سے رقم وصول کرتی ہے جس کی وجہ سے عام گاہک پر اس کا سیدھا بوجھ پڑتا ہے، کیوں کہ مال تیار کرنے والا جو حکومت کو مال پر جی ایس ٹی دیتا ہے وہ تاجروں سے وصول کرلیتا ہے پھر تاجر حضرات جو مال بیچنے پر جی ایس ٹی دیتے ہیں وہ گاہک سے لے لیتے ہیں اس طرح مال بنانے والے اور مال بیچنے والے پر اس کا اثر نہیں پڑتا ہے؛ بلکہ ان کو جی ایس ٹی ریٹرن کے نام پر مزید فائدہ بھی ہوجاتا ہے اس کا اصل بوجھ استعمال کرنے والے صارفین پر پڑتا ہے اس لیے اگر کوئی صارف کوئی سامان خریدے اور کمپنی کی طرف سے اس کو صراحت کردی جائے یا بل پر لکھ دیا جائے کہ یہ مال اتنے کا ہے اور اس پر اتنا جی ایس ٹی ہے تو صارف اس میں بھی بینک انٹرسٹ کی رقم دے سکتا ہے اس لیے کہ حکومت کا پیسہ حکومت کو پہونچ گیا اور صارف کا ذمہ بھی بری ہوگیا تو جس طرح انکم ٹیکس میں اس کے غیر شرعی ہونے کی وجہ سے انٹرسٹ کا پیسہ دینا جائز ہے اسی طرح جی ایس ٹی کے غیر شرعی ہونے کی وجہ سے اس میں انٹرسٹ کا پیسہ دینا جائز ہے۔

جی ایس ٹی میں انٹرسٹ دینے کے سلسلے میں ایک دوسری رائے

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ فروخت کرنے والا تو جی ایس ٹی میں بینک انٹرسٹ کی رقم دے سکتا ہے لیکن صارف جو سامان اپنے استعمال کے لیے خریدنے والا ہے وہ بینک انٹرسٹ کی رقم کو نہیں دے سکتا ہے مثلا ایک

آدمی آن لائن موبائل بک کرتا ہے اس کی قیمت چودہ ہزار ہے اس میں لکھا ہوتا ہے کہ گیارہ ہزار تو موبائل کی قیمت ہے اور تین ہزار جی ایس ٹی ہے اس صورت میں استعمال کے لیے خریدنے والا انٹرسٹ کی رقم سے تین ہزار ادا نہیں کرسکتا ہے؛ اس لیے کہ بائع نے جو چودہ ہزار قیمت بتائی ہے وہ سب ثمن ہے اور مکمل اس سامان کی قیمت؛ اس لیے اس میں سود کی رقم دینا گویا سود کو اپنے استعمال میں لانا ہے۔

لیکن یہ مسئلہ محل نظر ہے اس لیے کہ اس صورت میں بائع کے لیے بھی انٹرسٹ کی رقم دینا ناجائز ہونا چاہیے؛ اس لیے کہ انٹرسٹ کی رقم غیر واجبی ٹیکس میں دی جاتی ہے جب کہ بائع کے حق میں وہ غیر واجبی رہتی ہی نہیں ہے کیوں کہ وہ جس قدر جی ایس ٹی دیتا ہے وہ خریدار سے وصول کرلیتا ہے اب اگر اس نے اپنے جی ایس ٹی میں بینک کے انٹرسٹ کی رقم دے دی تو اس بائع کو دوگنا نفع ہوجائے گا ایک تو سرکار کی طرف سے جی ایس ٹی ریٹرن اس کو ملے گا، دوسرے یہ کہ اس نے اپنے جیب سے دینے کے بجائے انٹرسٹ کے پیسے دے دیے تیسرے یہ کہ اس نے صراحت کے ساتھ مشتری سے جی ایس ٹی کی رقم وصول کرلی جب کہ یہ بات عقل سے بالکل بعید معلوم ہوتی ہے۔

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جی ایس ٹی کا اصل بار مشتری پر پڑتا ہے اس لیے غیر واجبی ٹیکس یہ مشتری کے حق میں ہے نہ کہ بائع کے اس لیے کہ بائع نے جی ایس ٹی مشتری سے وصول کرلیا جب کہ مشتری کو جو سامان گیارہ ہزار میں ملنا چاہیے تھا وہ چودہ ہزار میں مل رہا ہے گویا کہ غیر واجبی ٹیکس مشتری کے حق میں پایا جاتا ہے کیوں کہ بائع صاف کہتا ہے کہ سامان کی اصل قیمت تو گیارہ ہی ہزار ہے ہاں جی ایس ٹی کے تین ہزار آپ کو دینے ہوں گے اس لیے احقر کی رائے ہے کہ یہ غیر شرعی اور غیر واجبی ٹیکس خریدار کے حق میں ہے ہاں چوں کہ حکومت کا مشتری سے وصول کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ وہ بائع کو مکلف بناتی ہے کہ وہ مشتری سے یہ رقم وصول کرے اور حکومت کو سامان کے حساب سے جی ایس ٹی ادا کرے یہی وجہ کہ جب حکومت جی ایس ٹی کا قانون لے کر آئی اور تاجروں نے اس پر اعتراض کیا تو حکومت نے ان کو یہ کہہ کر خاموش کردیا کہ اس میں تو تاجروں کا فائدہ ہے اس لیے کہ تاجر حضرات یہ رقم خریدار سے وصول کریں گے اور ان کے جی ایس ٹی ادا کرنے پر حکومت ان کو ریٹرن منافع کی شکل میں واپس کردے گی یہی وجہ ہے کہ تاجر حضرات صراحت کے ساتھ بلوں پر لکھتے ہیں کہ یہ سامان کی اصل قیمت ہے اور اتنا جی ایس ٹی ہے اگر مشتری سے وصول کرنا مقصود نہ ہوتا؛ بلکہ تاجروں سے ہی وصول کرنا مقصود ہوتا تو خریدار کو جی ایس ٹی بتانے کی ضرورت کیا ہے؟ آخر ہر سامان پر جی ایس ٹی رقم کی صراحت کیوں کی جاتی ہے؟ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حکومت اصل جی ایس ٹی خریدار سے وصول کرتی ہے

اس لیے اگر خریدار کو صراحت کے ساتھ معلوم ہو کہ اس سامان پر اتنا جی ایس ٹی ہے تو اس میں بینک انٹرسٹ کی رقم دینا جائز ہوگا ہاں اگر صراحت نہ ہو یا بل پر لکھا ہوا نہ ہو تو ایسی صورت میں کہا جائے گا کہ مجموعی رقم ہی اس سامان کی قیمت ہے اس صورت میں جی ایس ٹی کے نام پر انٹرسٹ کی رقم دینا جائز نہیں ہوگا۔

انٹرسٹ کی رقم کو بینک کے کاموں میں استعمال کرنا

بینک کی طرف سے بعض مرتبہ بینک کے کاموں پر چارج لیا جاتا ہے مثلاً ڈی ڈی بنانے پر چارج وصول کیا جاتا ہے، اسی طرح آن لائن ٹرانزکشن پر کچھ رقم وصول کی جاتی ہے، یا اے ٹی ایم کے استعمال کی ایک حد ہوتی ہے کہ ماہانہ تین مرتبہ فری پیسے نکال سکتے ہیں اس کے بعد پیسے نکالنے پر ہر مرتبہ کچھ چارج دینا ہوگا اس طرح کے کاموں میں انٹرسٹ کی رقم کا استعمال کرنا درست نہیں ہے اس لیے کہ یہ چارجیز غیر واجبی نہیں ہیں اس لیے اس میں انٹرسٹ کی رقم دینا درست نہیں ہوگا۔ (فتویٰ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند، فتوی نمبر: ۱۶۱۲۲۹) ہاں بعض بینکوں کی طرف سے قید ہوتی ہے کہ ہر وقت اکاؤنٹ میں مثلاً پانچ ہزار یا دس ہزار رکھنے ہوں گے اس میں کمی ہو جائے تو چارج وصول کیا جاتا ہے اس میں بظاہر انٹرسٹ کی رقم دینا جائز ہے اس لیے کہ اپنے پیسے کو رکھنے کے لیے پیسے کی کسی خاص مقدار کو لازم وضروری قرار دینا بظاہر غیر واجبی عمل ہے جس میں انٹرسٹ کی رقم دینے کی گنجائش ہے۔

انٹرسٹ کی رقم بینک کے سود میں دینا

اگر کسی کا بینک میں سیونگ اکاؤنٹ ہو اور اس کو اس پر سود مل رہا ہو اور اس نے بینک سے لون لیا ہے یا اس پر کسی دوسرے بینک کا سود آیا ہوا ہے تو اس کے لیے اس سود میں انٹرسٹ کی رقم دینا جائز ہے؛ اس لیے کہ سرکار کا پیسہ سرکار کو واپس جا رہا ہے اس لیے مال حرام کا جو حکم ہے کہ مالک کو واپس کر دیا جائے اس حکم پر عمل ہو رہا ہے لیکن جان بوجھ کر بلا کسی شدید عذر کے بینک سے سودی قرض لینا یہ حرام ہے اور ایسا کرنے والا سود لینے کی لعنت و ملامت کا مرتکب ہوگا۔ منتخباب نظام الفتاوی میں ہے: دوسرے یہ کہ یہ سود مرکزی حکومت سے ملتا ہے اور یہ بینک سے قرض لے کر جو سود دینا ہوتا ہے وہ بینک کو دینا ہوتا ہے اور بینک بھی مرکزی حکومت کا ہوتا ہے اور ہر حرام مال کا شرعی حکم یہ ہے کہ جہاں سے ملا ہو وہاں واپس کر سکے تو واپس کر دے پس اس قاعدہ شرعی کے تحت جو رقم سود کے نام پر سینٹرل گورنمنٹ سے ملی تھی اس کو بینک کے سود کے نام سے اگر چہ دیا مگر اصل میں جہاں کی وہ رقم تھی وہاں ہی پہونچا دی اس لیے یہ صورت شرعاً گنجائش رکھے گی۔ (منتخبات نظام الفتاوی، ۱۰۶/۳)

افاداتِ اکابر

اخلاص کے بغیر کوئی عمل کام نہ آئے گا

از افادات: حضرت محی السنہ شاہ ابرارالحق رحمہ اللہ

فرمایا: ایک جگہ میں نے دیکھا بحث چل رہی ہے کہ تعلیم زیادہ ضروری ہے یا تبلیغ ؟ میں نے کہا اللہ کے بندو! کس چیز میں پڑے ہوئے ہو؟ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ آنکھ کی زیادہ ضرورت ہے یا کان کی؟ ہنسے گا کوئی بھی شخص سن کر۔ کیوں کہ کان کا کام الگ ہے اور آنکھ کا الگ۔ دیکھنے کا کام کان نہیں کرسکتا اور سننے کا کام آنکھ نہیں کرسکتی، لہذا دونوں ضروری ہیں دونوں کا مقابلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر میں نے تیسری چیز اَور ہے، وہ ہے تزکیہ وہ البتہ دونوں سے اہم ہے، اس لئے کہ اس کے بغیر نہ تبلیغ کا عمل مقبول ہوگا اور نہ تعلیم کا۔

معلوم ہوا کہ علم وعمل کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے لیکن محض عمل کا وجود کافی نہیں، بلکہ اس میں قبول کی شان بھی ہونی چاہیئے، اور تبلیغ کی جدوجہد اور مدارس کے ماحول سے اعمال وجود میں آتے ہیں مگر قبولیت کے لائق تزکیہ کے بعد ہوتے ہیں۔ تزکیہ کا حاصل یہی ہے کہ گندے اخلاق ختم ہو جائیں اور ان گندہ اخلاق میں ریا جیسی مہلکہ بھی ہے، جب تک وہ نہیں نکلے گی تو ان سب اعمال کا کیا ہوگا، چناں چہ حدیث پاک میں ہے۔

سب سے پہلے قیامت میں جس شخص کا فیصلہ ہوگا وہ ایک شہید ہوگا جو حاضر کیا جائے گا تو اس سے پوچھا جائے گا تو نے اپنی مغفرت کے لئے کیا کیا؟ وہ کہے گا آپ کے راستے میں قتال کیا یہاں تک کہ شہید ہوگیا، حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ جھوٹ کہتا ہے تیرا مقصد تو یہ تھا کہ بڑا پہلوان کہلایا جائے، چناں چہ تجھے یہ لقب مل چکا، اور تیرا مطلب حاصل ہوگیا اب یہاں کیا رکھا ہے، حکم ہوگا اس کو منھ کے بل جہنم میں ڈال دیا جائے چنانچہ وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا پھر ایک صالح لایا جائے گا اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوگا پھر ایک قاری لایا جائے گا اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوگا پھر یہی معاملہ ایک سخی کے ساتھ ہوگا۔ (مختصر: از صحیح مسلم)

یہ سب اخلاص نہ ہونے کا نتیجہ ہوگا کہ اتنے بڑے بڑے عمل کئے مگر سب اکارت گئے۔

(ماخوذ از: نصیحۃ الابرار: ۱۶، ۱۷)

فقہ وفتاویٰ

آپ کے شرعی مسائل

از: مفتی ندیم الدین قاسمی*

قعدۂ اخیرہ میں مقتدی کی التحیات مکمل کرنے سے پہلے امام کا سلام پھیرنے کی صورت میں التحیات کا حکم۔

سوال: ایک شخص قعدۂ اخیرہ میں شامل ہوا وہ التحیات پڑھ ہی رہا تھا کہ امام صاحب نے سلام پھیر دیا تو کیا اس کے لیے التحیات مکمل پڑھنا ضروری ہے؟

جواب: صورتِ مسئولہ میں اگر کوئی شخص آخری قعدہ میں امام کے ساتھ نماز میں شامل ہو جائے اور اس کی التحیات مکمل ہونے سے پہلے ہی امام سلام پھیر دے تو اس صورت میں مقتدی کو چاہیے کہ التحیات پڑھ کر بقیہ نماز کی تکمیل کے لیے کھڑا ہو، اگر التحیات مکمل کیے بغیر کھڑا ہو گیا تو نماز کراہت کے ساتھ ہو جائے گی۔

(الفتاوی الھندیہ ۱/ ۹۰)

مقتدی امام کے ساتھ کب سلام پھیرے؟

سوال: امام کے پیچھے مقتدی سلام کب پھیرے؟ ساتھ ساتھ سلام پھیرے یا امام کے دونوں سلام پھیرنے کے بعد سلام پھیرے۔ کیا حکم ہے؟

جواب: جماعت کی نماز میں مقتدی کے لیے (جب کہ وہ مسبوق نہ ہو) سلام پھیرنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ مقتدی امام کی پیروی اور اتباع کرتے ہوئے امام کے ساتھ ساتھ سلام پھیرے، نہ امام سے پہلے سلام پھیرے اور نہ امام کے بعد۔ (البحر الرائق شرح کنز الدقائق: ۱/ ۳۵۲)

اگر مدرک کو خیال ہو کہ اس کی ایک رکعت فوت ہو گئی

سوال: اگر مدرک یہ سمجھے کہ اس کی ایک رکعت رہ گئی ہے اور وہ امام کے ساتھ سلام پھیرنے کے بجائے کھڑا ہو جائے، مگر فاتحہ پڑھنے کے بعد اسے یاد آیا کہ اس نے مکمل رکعتیں ادا کی ہے تو اب وہ کیا کرے؟

جواب: اگر کوئی شخص امام کے ساتھ نماز میں شروع سے شامل تھا، لیکن اس کو گمان یہ ہوا کہ اس کی رکعت فوت ہوئی ہے اور وہ امام کے سلام کے بعد کھڑا ہو گیا تو ایسے شخص کو جیسے ہی رکعت کا فوت نہ ہونا یاد آئے تو اُس کو چاہیے کہ بیٹھ جائے اور سلام پھیر لے اور اس پر سلام کی تاخیر کی وجہ سے سجدۂ سہو واجب ہو گا۔

* استاذ شعبۂ عالمیت ادارہ ہذا

اور اگر پانچویں رکعت کا سجدہ کرنے کے بعد یاد آیا کہ کوئی رکعت فوت نہیں ہوئی تھی تو ایسی صورت میں مذکورہ شخص چھٹی رکعت ملا لے، اور آخر میں سجدہ سہو کر لے، اخیر کی یہ دو رکعت اُس کے لیے نفل ہو جائیں گی۔(الفتاوی الھندیہ ۱/۱۲۹)

جنبی کو سلام کرنا

سوال: جنبی کو سلام کرنا یا جنبی کا دوسرے کو سلام کرنا درست ہے یا نہیں؟

جواب: جنبی کو سلام کرنا اسی طرح جنبی کا دوسرے کو سلام کرنا، دونوں جائز ہیں، لیکن تلاوتِ قرآن ناجائز ہے۔(فتاویٰ قاسمیہ: ۲۳/۳۷۳)

بچوں کے لئے گڑے گڑیاں خریدنا

سوال: بچوں کے لئے گڈیاں گڈے خریدنا اور گھر میں ان کو رکھنا کیسا ہے؟

جواب: گڑے، گڑیاں یہ ایک قسم کے مجسمے ہوتے ہیں، اور حدیث شریف میں حضرت عائشہؓ کی گڑیوں سے متعلق جو واقعہ مشہور ہے، یہ اس زمانہ کا ہے جس زمانہ میں تصویر کشی کی ممانعت نازل نہیں ہوئی تھی، اس لئے گڑے گڑیاں خریدنا جائز نہیں ہے۔(فتاویٰ قاسمیہ ۲۴/۵۷۲)

موت کے وقت کلمۂ کفر نکل جانے کا حکم

سوال: بسا اوقات کسی مسلمان کے ساتھ یہ صورتحال پیش آجاتی ہے کہ جب اس کو موت آنے لگتی ہے تو اس کے منہ سے کچھ ایسے الفاظ اور جملے نکل جاتے ہیں کہ جن سے کفر اور شرک ظاہر ہو رہا ہوتا ہے یا جن پر کفر اور شرک کا حکم لگایا جا سکتا ہے، تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: اگر کسی مسلمان کے منہ سے موت کے وقت کفریہ یا شرکیہ کلمہ نکل جائے تو اس سے یہی سمجھ لینا چاہیے کہ موت کی سختی کی وجہ سے ہوش وحواس ٹھکانے نہ رہے، اور یہ کلمات نکل گئے، ایسی صورت میں اس پر کفر کا حکم لگانا درست نہیں ہے، اور اس معاملے کی ہرگز تشہیر نہیں کرنی چاہیے؛ بلکہ اس کو چھپا لینا چاہیے تاکہ اس کی وجہ سے فتنہ نہ پھیلے اور ناسمجھ لوگ بدگمانی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔(البحر الرائق کتاب الجنائز: ۲/۲۹۹)

کیا کسی کے قسم دینے سے قسم ہو جائے گی؟

سوال: جس شخص کو قسم دے کر بات کہی جائے کیا اس سے وہ قسم اس پر لازم ہو جاتی ہے؟

جواب: اس سے قسم لازم نہیں ہوتی لیکن اس کے قسم دینے سے وہ بھی قسم کھا لے تو قسم لازم ہو جائے گی۔(فتاویٰ محمودیہ ۱۴/۲۹،۳۰)

ASHRAFUL JARAID MONTHLY Rs20/-
RNI No: APURD/2007/24089 Postal. No: RD/RNP/HSE/884/20-22
Date of Publication 3rd February-21, date of Posting 5th Feb-21

Printed.Published and Owned by Mohd Abdul Qavi, # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059
Published from: # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059
Editor : Mohammed Abdul Qavi. Printed at: Aish Offset Printers, Behind Masjid e Meraj, Sayeedabad, Hyd.